مسلکی تعصب کی تعریف کی روشنی میں پاکستانی معاشرے میں اس کے مظاہر کا جائزہ

The review of the perceptions of Sectarian Prejudice in Pakistani society in the light of its definition

ڈاکٹر جنید اکبر *

ڈاکٹر محمد اکرام اللہ **

ABSTRACT

This research paper deals in sectarian prejudices. The Islamic researchers have divided prejudices into two i.e. praised (glorified) prejudices and nefarious prejudices. Most of relevant information regarding the topic is available in Arabic literature. Two of the books are more popular and related to the topic; one is 'Al Qanoon Al Duwali wa Hazar Al-Ta'asub Al Dini' written by Dr Muhammad Thamir Al Saadoon, the other is 'Al Ta'asub wal Tai'fiyyah' written by Dr Ahmad Abdul Aal. This article covers the definition of 'Ta'asub' (prejudices), its kinds, definition of 'Tamadhub', difference in prejudices and Tamadhub, causes of sectarian prejudices and its situation in Pakistani society. Some of the important queries have been responded in this article, for example; is anyone permitted to propagate his/her sectarian prejudices? In this regard the existing prejudices and extremism in Pakistani society have been reflected in this article in case someone is allowed to propagate sectarian thoughts. It has also been mentioned that on the bases of difference between praised and nefarious prejudices the followers of a specific sect in the garb of praised prejudices creates differences with followers of the other sect. Therefore the division in praised and nefarious prejudices should be ended and the term 'Tamazhob' and 'Taasob' (prejudices) should be used instead because prejudice in any form is 'haram' (forbidden) and as a result sectarian prejudices in Pakistan can be mitigated.

Keywords: *Sectarian, praised, prejudices, nefarious prejudices, Tamadhub, followers.*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علومِ اسلامیہ ودینیہ، جامعہ ہری پور

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علومِ اسلامیہ ودینیہ، جامعہ ہری پور

تمہید

پاکستانی معاشرے میں لوگوں کے باہمی اختلافات کی وجوہات میں لسانی ہم آہنگی، سیاسی اشتراک اور مسلکی اتحاد کا نہ ہونا سرِ فہرست ہے جس کی وجہ سے تعصب کی ابتداء ہوتی ہے کیوں کہ تعصب کا تعلق انسانی رویہ سے ہوتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں بسنے والے افراد کی اکثریت ایک خاص فقہی مسلک سے وابستہ ہے۔ ان مسالک میں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث، اکثریتی مسالک ہونے کی وجہ سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہر مسلک سے وابستہ فرد اپنے مسلک کو ہی درست اور حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے مسلک سے وابستہ افراد کے ساتھ اس کا اکثر و بیشتر رویہ متعصبانہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مسالکِ اربعہ فقہیہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں سے کسی ایک کی پیروی عینِ شریعت ہے اور اس کی بنیاد پر کسی شخص کو مطعون سمجھنا انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ کسی خاص فقہی مسلک سے وابستگی کو علماء کرام نے "تمذہب" کا نام دیا ہے۔

اس مقالہ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگرچہ تعصب کو مذموم اور ممدوح جیسی ذیلی اقسام میں تقسیم کر کے اس کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بسا اوقات تعصب ممدوح کی آڑ میں اپنے غلط موقف کو بھی درست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو مختلف مسالک سے وابستہ افراد کے درمیان مسلکی تعصب کو بڑھاوا دینے کا باعث بن جاتا ہے۔ مقالہ ہذا میں مسلکی تعصب کے ضمن میں آنے والے چند ذیلی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مثلاً مسلکی اشاعت و ترویج کی اجازت، اپنے مسلک کے خطیب کی کسی ایسی مسجد میں تعیناتی کروانا جہاں دوسرے مسلک والے اکثریت میں ہوں اور مختلف تعلیمی بورڈز سے الحاق شدہ دینی مدارس میں دوسرے مسلک کے حامل طلبہ کو داخلہ نہ دینا وغیرہ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

تعصب کے بارے میں اردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر کتاب یا مقالہ تحریر نہیں کیا گیا ہے البتہ عربی زبان میں اس موضوع پر چند اہم کتب موجود ہیں۔ مثلاً محمد الغزالی احمد السقا کی کتاب "عن التعصب"، ڈاکٹر مشعل بن محمد الحدادی کا چار صفحات پر مشتمل مقالہ "التعصب: تعریفہ و انواعہ و اضرارہ و حکمہ"، ڈاکٹر محمد ثامر السعدون کی کتاب "القانون الدولی و حضر التعصب الدینی" اور ڈاکٹر احمد عبد العال کی کتاب "التعصب والطائفیۃ"۔ ان دونوں کتابوں میں تعصب کا مفہوم، اقسام اور اسلام کا تعصب کے بارے میں موقف کی وضاحت بیان ہوئی ہے۔ مقالہ ہذا میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں پاکستانی معاشرہ میں موجود مسلکی تعصب کے مظاہر کی نشاندہی کی گئی ہے۔

تعصب کا لغوی مفہوم

ماہرین اہل لغت نے تعصب کی تعریف میں مادہ ع،ص،ب کے ذیل میں آنے والے الفاظ کی مختلف تعبیرات بیان کی ہیں۔ چنانچہ تعصب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"عدم قبول الحق عند ظهور الدليل"(۱)

دلیل کے قائم ہونے کے باوجود حق ماننے سے انکار کرنا۔

لسان العرب میں ہے:

"وقيل هو ذهاب البصر"(۲)

یعنی تعصب کا مطلب ہے نہ دیکھنا، نظر کا ختم ہونا۔

اپنے دوست کے مخالفین کے سامنے اپنے دوست کے لئے تعصب کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے:

"وقف في جانبه مناصرا له بشره"(۳)

اپنے دوست کو دشمن کے شر سے بچانے کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہونا۔

تعصب کا اصطلاحی مفہوم

لغوی تعریف کی طرح تعصب کی اصطلاحی تعریف میں بھی شدت اور شدید کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اصطلاحی مفہوم کے بارے میں کہا گیا ہے:

" التعصب هوالشديد واخذ الامر بشدة و عنف"(۴)

تعصب شدت کا نام ہے یعنی کسی کام کو انتہائی سختی اور شدت سے انجام دینا۔

اسی طرح تعصب کے مفہوم میں کہا گیا ہے:

"هو نصر قومه او جماعته او من يؤمن بمبادئهم سواء كانوا محققين امر مبطلين وسواء كانوا ظالمين او مظلومين"(۵)

تعصب اپنی قوم، جماعت یا ان کے بنیادی اعتقادات پر ایمان رکھنے والوں کی مدد کرنا، چاہے وہ کسی امر کو ثابت کرنے والے ہوں یا باطل کرنے والے اور خواہ وہ ظالم ہوں یا مظلوم۔

---

(۱) ڈاکٹر احمد مختار عبد الحمید عمر، معجم اللغۃ العربیۃ المعاصرۃ، عالم الکتب، طبع اول: ۲۰۰۸ء، ۲/ ۱۵۰۵

(۲) ابن منظور افریقی، محمد بن مکرم بن علی، لسان العرب، دار صادر، بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۴ھ، ۱۵/ ۵۶

(۳) عبد الغنی، ابو العزم، معجم الغنی، مادہ: "تعصب"

(۴) عادل الدمخی، التعصب: مظاہرہ، اسبابہ، نتائجہ، البعد الشرعی، ص: ۲۔ یہ عربی زبان میں تحریر کردہ ایک مقالہ ہے جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور انٹرنیٹ سے ورڈ فارمیٹ میں ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔

(۵) مشوخی، ڈاکٹر عبد اللہ بن سلیمان، الحوار وآدابہ فی الاسلام، العبیکان للنشر، ص: ۹۹

تعصبِ مذہبی کا لغوی مفہوم

دینی اعتبار سے بھی تعصب کا معنی بے جا سختی اور شدت ہے۔ "تعصب فی دینہ" کا مطلب یہ ہے:

"كان شديداً غيور فبه مدافعاً عنه"

وہ انتہائی سختی اور شدت سے اس کا دفاع کرتا ہے۔

تعصبِ مذہبی کا اصطلاحی مفہوم

"المغالاة فی الانتصار للرای الفقهي او للمذهب الفقهی دون دليل"(۱)

بغیر کسی دلیل کے کسی فقہی مذہب یا فقہی رائے کی تائید کرنے میں شدت اختیار کرنا۔

مندرجہ بالا تعریفات میں قدر مشترک یہ ہے کہ تعصب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اتنا متشدد اور سخت ہو کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو دوسرے کو بلا دلیل باطل قرار دیتا ہو۔ محمد الغزالی(۲) تعصب کی تعریف یہ کرتے ہیں:

"التعصب هو شعور داخلی يجعل الانسان يرى نفسه على حق، ويرى الآخر على باطل"(۳)

تعصب وہ نفسانی کیفیت ہے کہ جس کی وجہ سے انسان خود کو حق پر اور دوسرے کو باطل پر سمجھتا ہے۔

"تعصب" کے لیے انگریزی زبان میں (Prejudice) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیمبرج ڈکشنری نے تعصب کی تعریف یہ کی ہے:

"An unfair and unreasonable opinion or feeling especially when formed without enough thought or knowledge"(4)

ایک غیر منصفانہ اور غیر مناسب رائے یا خاص طور پر جب کافی مضبوط سوچ اور علم کے بغیر ہو۔

تعصب کی اقسام

یہ فطرت خداوندی ہے کہ انسانی امور و معاملات میں باہمی اختلاف موجود رہے گا یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ تمام انسانیت میں ایک رائے پر متفق و متحد ہو سکے۔ کیوں کہ ہر آدمی کی ذہنی صلاحیت اور سوچنے کا انداز

---

(۱) محمد ابو زہرہ، تاریخ المذاہب الاسلامیۃ، دار الفکر العربی، قاہرہ، ۱۹۸۷ء، ۱/۸، ۷

(۲) محمد الغزالی کا پورا نام محمد الغزالی احمد السقا ہے۔ آپ کی پیدائش ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو مصر میں ہوئی اور ۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔ آپ کو مصر میں فکرِ اسلامی کی تجدید و احیاء کی وجہ سے "ادیب الدعوۃ" کا لقب دیا گیا۔

(۳) محمد الغزالی، عن التعصب، دار دون للنشر والتوزیع، ۲۰۱۵ء، ص:۲

(۴) dictionary.cambridge.org

دوسرے سے الگ ہوتا ہے، چنانچہ علماء نے اختلاف کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، محمود اور مذموم، چونکہ تعصب بھی باہمی اختلاف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اس لئے تعصب کی بھی دو اقسام بن جاتی ہیں اور تعصبِ محمود اور تعصبِ مذموم۔

تعصبِ مذموم

تعصبِ مذموم کا مطلب یہ ہے کہ جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ فقہی اعتبار سے اس سے مراد ان اعمال پر اصرار کرنا ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔ صرف عناد اور تکبر کی وجہ سے اس پر عمل ہو رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کے تعصب سے امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے۔ آج مسلم معاشرہ میں مذہبی بنیادوں پر جو بعد اور نفرت ہے وہ سب اسی تعصب کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ پھر اس کی وجہ سے مختلف مسالک کے پیروکاروں کے درمیان باہمی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

محمد الغزالی تعصب کے ظہور کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب انسان کسی دوسرے انسان کو حقیر سمجھتا ہے، ان کے حقوق کا خیال نہیں کرتا تو دراصل یہ شخص تعصب سے کام لیتا ہے۔[۱]

ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان المشوخی[۲] نے تعصب مذموم کو امت مسلمہ کے اتحاد کے لیے زہر قاتل قرار دیا ہے اور اسے باہمی مسائل کے حل میں مکالمہ و گفتگو کو کمزور کرنے والا قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"التعصب وهو من الافات التی تقوض الحوار و تهدمه"[۳]

تعصب ان آفات میں سے ہے جو امت کے درمیان مکالمہ کو کمزور کر دیتا ہے۔

اس وضاحت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی تغیر دلیل اور ذاتی خواہشات کی وجہ سے اپنے مسلک کے معاملہ میں سخت ہے تو اس کا یہ رویہ تعصب مذموم میں آتا ہے۔

تعصب محمود

جب تعصب حق کے لئے ہو تو وہ محمود ہے یہاں پر تعصب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بندہ حق کے ساتھ قائم رہے اور ہر صورت اس پر عمل کرے۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ دوسرے حق کو رد کیا جائے پس جو شخص قرآن و سنت پر عمل کرنے میں سختی کرتا ہے تو یہ تعصب ان کا محمود ہے اگرچہ لوگوں کو بظاہر ٹھیک نہیں لگتا کیونکہ لوگوں میں اکثریت ان کی ہے جو دین پر سختی سے عمل پیرا ہونے کو بھی تعصب خیال کرتے ہیں۔

---

(۱) محمد الغزالی، عن التعصب، ص:۵

(۲) ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان اُردن میں ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ جامعہ الامام محمد بن سعود ریاض میں شعبہ شریعہ میں پروفیسر ہیں۔

(۳) مشوخی، ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان، الحوار وآدابہ فی الاسلام، ص:۹۹

تعصبِ محمود پر نظر ثانی

علماء کرام نے اپنے زمانے کے اعتبار سے یا عوام الناس کو سمجھانے کے لیے طرداًللباب، تعصبِ محمود کے نام سے ایک قسم بنادی ہے، البتہ یقینی طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سب سے پہلے یہ اصطلاح کس نے وضع کی ہے؟

در حقیقت تعصب ہر اعتبار سے مذموم ہی مذموم ہے، تعصب اور محمود جمع ہی نہیں ہو سکتے۔ تعصبِ محمود کی جو تفصیل کتابوں میں درج ہے، در حقیقت وہ تصلب فی الدین یا تمذہب میں مندرج ہے، جیسے آئندہ سطور میں اس کی مفصل وضاحت تحریر کی گئی ہے۔

تعصب کو مذموم و محمود میں تقسیم کر کے مسلکی تعصب روا رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے، پھر جب کسی کے رویے کو تعصب قرار دیا جائے تو یہی جواب ملتا ہے کہ یہ تعصب محمود ہے، نہ کہ مذموم۔ اس لیے علمی حلقوں میں اس پر از سرِ نو بحث کی ضرورت ہے کہ کیا تعصب سراپائے مذمت نہیں؟ کوئی تعصب محمود ہو سکتا ہے؟ تصلب و تعصب کی واضح منظر کشی کیسے ممکن ہو؟

تعصب اور تصلب فی الدین میں فرق

اس بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جب حضرت حارث بن مالک نے آپ سے پوچھا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے تو آپ نے فرمایا "عرفت فالزم" یعنی جب آپ نے ایک مرتبہ حق کو سمجھا پہچان لیا تو ہمیشہ اس پر قائم رہو۔"

اسی طرح انسان جب کسی بھی حق کی پہچان کر لیتا ہے تو حق پر قائم رہتا ہے تعصب محمود حق سے شروع ہوتا ہے اور حق پر ختم ہو جاتا ہے فقہی مسالک اعتبار سے تعصب کی یہی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ جو شخص امام شافعی کے قول کو ترجیح دیتا ہے اور اس دوسرے شخص کو غلط قرار نہیں دے رہا جو امام مالک کے قول کو ترجیح دیتا ہے تو یہ محمود ہے۔[1]

اسی طرح ابن عابدین نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ جب فخر الاسلام سے تعصب کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

"الصلابة فی المذهب واجبه والتعصب لایجوز اپنے مذہب پر عمل میں سختی ضروری ہے مگر تعصب درست نہیں، پھر کہا: "صلابہ" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اس کے مطابق عمل کرے جو اس کا مذہب ہے اور جو اسے ٹھیک لگتا ہے اور جہالت کی بنا پر کسی دوسرے کے

---

(۱) ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ النبویۃ، مملکۃ عربیۃ سعودیۃ، ۱۹۹۵ء، ۲۰/ ۲۹۲

مذہب کو غلط قرار دینا تعصب ہوتا ہے کیونکہ تمام ائمہ کرام نے حق کی طلب کی ہے اور وہ سب کے سب حق پر تھے۔"(۱)

حدیث میں ہے:

«يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ: «لَا، وَلَكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُعِينَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ» (۲)

اے اللہ کے رسول، کیا کسی شخص کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تعصب یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی ظلم میں معاونت کرے۔

تمام فقہی مسالک میں اختلاف کا سبب صرف وجہ ترجیح اور اختلافِ اُصول ہوتا ہے، نہ کہ حق و باطل۔ چنانچہ کبھی بھی کسی مسلک کے بانی یا ان کے علماء نے یہ نہیں کہا ہے کہ ہم حق پر ہیں اس لئے ہمارے مسلک کی تبلیغ کی جائے ۔ یہ تو آپ ﷺ نے امت پر بڑا احسان کیا ہے کہ جس نے شریعت اسلام کے احکامات میں توسع اختیار فرمایا ہے اور اس امت کے لئے اس بات کی اجازت رکھی ہے کہ آپ کے بیان کردہ طریقوں میں جو بھی طریقہ اختیار کر لیا جائے وہ سنت ہے۔

تمذہب کی لغوی تعریف

"تمذہب" لغوی لحاظ سے مصدر ہے جبکہ اس سے "تمذہب" فعل "تمذہب، یتمذہب تمذہباً" ہے۔(۳)

"تمذہب" "تمفعل" کے وزن پر ہے۔ مشہور نحوی سیبویہ "تمفعل" کے وزن کے بارے میں کہتا ہیں کہ یہ اظہار اور اخذ کے معنی پر آتا ہے۔(۴)

محیط المحیط میں ہے:

"تمذہب کا معنی ہے کسی مسلک، مذہب کا اتباع کرنا۔"(۵)

البستانی نے یہاں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ تمذہب کا اکثر استعمال ادیان میں ہوتا ہے۔(۶)

---

(۱) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز الدمشقی، العقود الدریۃ، دار المعرفۃ، ۲/ ۳۳۳

(۲) احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند الشامیین، حدیث کعب بن عیاض، حدیث نمبر: ۱۷۴۷۲

(۳) ابراہیم انیس، عبد الحلیم منتصر، عطیۃ الصوالحی، محمد خلف اللہ احمد، المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیۃ، مکتبۃ الشروق الدولیۃ، ۲۰۰۴، مادہ: ذہب

(۴) حسن باشا بن علاء الدین الاسود، المفراح فی شرح مراح الارواح فی التصریف، دار عمار للنشر والتوزیع، ۲۰۰۶ء، ص: ۵۷

(۵) بطرس البستانی، محیط المحیط، مکتبۃ لبنان، مادہ: ذہب۔

(۶) ایضاً

تمذہب کی اصطلاحی تعریف

تمذہب کی اصطلاحی تعریف کتبِ فقہ اور اصولِ فقہ میں صراحتاً مذکور نہیں ہے بلکہ مختلف علماءِ کرام کے کسی خاص فقہی مسلک کو اختیار کرنے کے عملی اظہار اور پھر اس فقہی مسلک کے اصولوں کے مطابق تحریر کردہ کتب کی عبارات اور تشریحات سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ذیل میں تمذہب کی دو تعریفات بیان کی جاتی ہیں:

پہلی تعریف:

"الالتزام غير المجتهد مذهباً معيناً،يعتقده ارجح او مساوياً لغيره"

غیر مجتہد کا کسی معین مذہب کو اس کے راجح ہونے یا کسی دوسرے مذہب کے مساوی قرار دیتے ہوئے اختیار کرنا۔

یہ تعریف تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ[۱] کی کتاب جمع الجوامع میں "عامی" کے لئے کسی خاص فقہی مسلک کو اختیار کرنے کے وجوب کو بیان کرنے سے اخذ کی گئی ہے[۲] کیونکہ اس کتاب کے شارحین نے شرح کرتے وقت "التمذہب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔[۳]

دوسری تعریف:

شیخ محمد خضری بک نے تمذہب کی تعریف میں یہ کہا ہے:

"تلقى الاحكام من امام معين، واعتبار اقواله كانها نصوص من الشارع يلزم المقلد اتباعها"[۴]

کسی معین امام کے احکام پر عمل کرنا اور اس کے اقوال کا اعتبار کرنا گویا کہ شارع کی طرف سے ہے جس کی اتباع کرنا مقلد پر لازم ہے۔

---

(۱) تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا پورا نام عبد الوہاب بن علی بن عبد الکافی السبکی ہے۔ قاہرہ میں ۷۲۷ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ شافعی فقیہ، ادیب، مؤرخ اور متکلم تھے۔ آپ کو مؤلفات میں طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، طبقات الشافعیۃ الوسطیٰ، طبقات الشافعیۃ الصغریٰ اور شرح منہاج البیضاوی فی اصول الفقہ شامل ہیں۔ دمشق میں ۷۷۱ھ کو ۴۴ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔

(۲) سبکی، تاج الدین، جمع الجوامع، ص:۱۲۳

(۳) زرکشی، محمد بن عبد اللہ بن بہادر، تشنیف المسامع بجمع الجوامع، مکتبۃ قرطبۃ للبحث العلمی واحیاء التراث، طبع اول: ۱۹۹۸ء، ۶۱۹/۴

(۴) محمد خضری بک، تاریخ التشریع الاسلامی، ص:۳۲۳، بحوالہ خالد بن مساعد، التمذہب، دار التدمریۃ، ریاض، ۲۰۱۳ء، ۱/۷۹

تعصب وتمذہب میں فرق

تعصب اور تمذہب کے مفاہیم کی وضاحت کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہب کو حق ماننا اور اس کے علاوہ مذاہب کو باطل قرار دینا جب کہ تمذہب کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ اسی ایک مذہب پر عمل کرنا اور دیگر مذاہب کو بھی حق جاننا۔

تمذہب کا اختیار کرنا

اہل سنت والجماعت نے فروعی مسائل میں تقلید کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں کہا ہے کہ مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کی تقلید کرنے پر امت کا اجماع ہے۔[۱]

مشہور حنفی فقیہ ابن امیر حاج (م۸۷۹ھ) نے تمذہب کو عام شخص کے لیے لازم قرار دیا ہے:

"غير المجتهد المطلق يلزمه عند الجمهور التقليد وان كان مجتهداً فى بعض مسائل الفقه"

جمہور کے نزدیک غیر مجتہد کے لیے تقلید لازم ہے اگرچہ وہ فقہ کے بعض مسائل میں مجتہد ہو۔

دلیل کے طور پر انہوں نے قرآن کی آیت ﴿فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون﴾[۲] پیش کی ہے کہ یہ اس آیت میں عموم ہے مطلق عامی کے لئے بھی ہے اور جس کو بعض مسائل میں علم حاصل ہو۔ عبد الفتح بن صالح نے ابن الحاج کی تائید میں کہا ہے کہ اس آیت میں عدم علم کی وجہ سے سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے بس جب بھی کسی کو کسی مسئلہ کے بارے میں خود علم نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ کسی اور سے سوال کرے۔[۳]

امام غزالی نے عامی کی تقلید کے بارے میں کہا ہے:

"العامى يجب عليه الاستفتاء واتباع العلماء"[۴]

غیر عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ علماء کی اتباع کرے اور ان سے مسائل کے بارے میں پوچھا کرے۔

الذخیرۃ للقراضی میں ابن قصار کے حوالے سے امام مالک کا قول نقل کیا ہے:

"يجب على العوام تقليد المجتهدين فى الاحكام"[۱]

---

(۱) دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/ ۱۲۳

(۲) سورۃ الانبیاء: ۷

(۳) یافعی، عبد الفتح بن صالح قدیش، التمذہب: دراسۃ تاصیلیۃ مقارنۃ للمسائل المتعلقۃ للتمذہب، دار النوادر المبین للدراسات والنشر، ۲۰۱۶ء، ص: ۱۰۰

(۴) غزالی، محمد بن محمد، المستصفیٰ، دار الکتب العلمیۃ، طبع اول: ۱۹۹۳ء، ۱/ ۲۷۲

عوام کے لیے احکام میں مجتہدین کی تقلید ضروری ہے۔

ابن قدامہ نے فروعی مسائل میں تقلید کرنے پر اجماع ذکر کیا ہے:

"اما التقليد فی الفروع: فهو جائزاً اجماعاً فكانت الحجة فيه الاجماع"

رہی بات فروع میں تقلید کی تو وہ بالاجماع جائز ہے اور اجماع اس کی دلیل ہے۔

فقہی مذاہب کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں گزرا کہ کسی ایک نے کسی خاص طریقہ پر عمل کرنے کو حق اور اس کے علاوہ عمل کرنے کو باطل قرار دیا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان مسالک کے علماء اور مجتہدین کے درمیان کسی ایک طریقہ کو راجح کہنے کے لئے دلیل دینے کا سلسلہ قائم رہا ہے۔ یہ کام دین اسلام کی خدمت ہے تمام اپنے زمانے کے نہایت متقی تھے جنہوں نے روزمرہ کے مسائل کی بحث کی اور کتاب و سنت کی روشنی میں امت کے لئے فقہ کے نام سے ایک ایسا ذخیرہ تیار کر دیا جس نے لیے آسانی کے راستے بتا دیے۔

حقیقت میں ان مسالک کے کسی ایک امام کی تقلید گویا نبی کریم کی تقلید کرنا ہے کہ امام صرف نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو واضح کرنے اور بتانے والے ہیں کوئی بھی ان اماموں کو معصوم نہیں سمجھتا خود امام ابو حنیفہ اپنے شاگردوں سے بہت سے مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے ہاں البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امت کی اکثریت براہ راست قرآن و سنت سے استفادہ نہیں کر سکتی لہٰذا ضروری ہے کہ وہ کسی امام کی تقلید کرے۔

امت مسلمہ کے چار بڑے فقہی مذاہب کا تنقید و تجزیہ کیا چکا ہے، ان پر عمل کرنے میں ہزار سال گزر چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ امت کی اکثریت ان چار مسالک سے وابستہ ہے۔ ان فقہی مسالک کی اشاعت و ترویج کے متعلق ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

> "یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے کہ کسی خاص علاقے کے لوگ کسی خاص اجتہاد کی پیروی کرنے لگے ہیں، یہ تمام فقہی ذخیرہ سب مسلمانوں کا ہے چنانچہ امام مالک اور ان کے اجتہاد کی پیروی کرنے والے فقہاء نے جو فقہی ذخیرہ تیار کیا ہے وہ برصغیر کے مسلمانوں کا بھی فقہی ذخیرہ ہے۔"(۲)

تاہم عمل کے اعتبار سے کسی ایک فقہی مسلک کو اختیار کرنا ضروری ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک وقت تمام مسالک کی تقلید کی جائے یہ بھی جائز نہیں کہ انسانی سہولت کے لئے کبھی کسی ایک مسلک کی پیروی کی جائے اور کبھی کسی دوسرے مسلک کی، ایسا کرنے کو علماء نے نفسانی خواہشات کی پیروی قرار دیا ہے۔ یہ صورتحال تب ہوتی ہے

---

(۱) قرافی، احمد بن ادریس بن عبد الرحمٰن، الذخیرۃ، دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع اول: ۱۹۹۴ء، ۱/ ۱۴۰

(۲) غازی، ڈاکٹر محمود احمد، محاضرات فقہ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ص: ۴۷۶

جب کوئی شخص کسی مسئلہ میں ایک مسلک کو اختیار کرتا ہے جو زیادہ آسان ہو، اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے مسلک کو، اور اسی طرح تلفیق کرتے ہوئے ائمہ مجتہدین میں کسی امام کے مذہب کا پابند نہ ہو۔[۱]

مذہب/مسلک کو ترک کرنا

مالکی فقیہ شیخ علیش[۲] (م۱۲۹۹ھ) نے ابو العباس القباب (م۷۷۹ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مذہب کو ترک کر کے کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کی دو صورتیں ہیں:

- پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی اپنے ایک مذہب کو جس پر اب تک قائم تھا مکمل طور پر چھوڑ دے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی کسی خاص مسئلہ میں اپنا مسلک ترک کر کے دوسرے مذہب کے مطابق اس مسئلہ میں عمل کرے۔[۳]

عبد الفتاح یافعی[۴] نے اس شخص کے سارے احوال کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ جس نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا ہو، ان کے مطابق مسلک تبدیل کرنے والے کے چند ایک احوال ہوتے ہیں:

۱. ایک حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی صرف دنیوی اغراض کے لیے اپنا مسلک ترک کر دیتا ہے مثلاً کسی ملازمت کے حصول کے لیے یا امراء کی قربت حاصل کرنے کے لیے۔ اس قسم کے شخص کی پھر دو حالتیں ہوتی ہیں:

- ایک یہ کہ جاہل ہے اپنے مذہب کے امام کے علاوہ اسے اپنے مذہب کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں۔ اس قسم کے شخص کا اپنے مذہب کو تبدیل کرنا تحریم کے حکم میں نہیں آتا۔[۵]
- اس کی دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اپنا مسلک چھوڑنے والا عالم فقیہ آدمی ہے اور یہ بھی صرف دنیاوی مفاد کے لئے اپنا مذہب ترک کر دیتا ہے تو اس کی اجازت نہیں ہے یہ تحریم کے حکم میں آتا ہے۔[۶]

---

(۱) اسفارینی، محمد بن احمد، التحقیق فی بطلان التلفیق، دار الصمیعی، ریاض، ۱۹۹۸ء، ص:۱۳۵

(۲) شیخ علیش کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد اور لقب علیش ہے۔ ۱۲۱۷ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۴۰ کتابیں مختلف علوم وفنون میں تالیف کی ہیں جن میں تدریب المبتدی اور تذکرۃ المنتہیٰ شامل ہیں۔ آپ نے ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔

(۳) محمد بن احمد بن محمد علیش، فتح العلی المالک فی الفتویٰ علی مذہب الامام مالک، دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، بیروت، ص:۵۹

(۴) عبد الفتاح کا پورا نام عبد الفتاح بن صالح بن محمد قریش الیافعی ہے۔ یمن میں ۱۳۹۴ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ قطر کی وزارت اوقاف اور یمن کی جمعیۃ الاحسان کے رکن ہیں۔ آپ کی مؤلفات میں التفسیر الاشارۃ: دراسۃ تاصیلیۃ اور تکرار العمرۃ: دراسۃ فقھیۃ شامل ہیں۔

(۵) یافعی، التمذھب، ص:۱۸۰

(۶) ایضاً

۲. دوسری حالت میں جب کہ کسی شخص کا اپنا مسلک چھوڑنا دینی غرض کے لیے ہوتا ہے تو اس کی بھی دو حالتیں ہیں۔

- پہلی حالت یہ ہے کہ یہ خود فقیہ ہے اور دلائل کی روشنی میں اپنا پہلا مذہب چھوڑ دیتا ہے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔
- دوسری حالت یہ ہے کہ جس وقت کوئی ایسا شخص اپنا مذہب ترک کر دیتا ہے جو اپنے مذہب کی فقہ سے جاہل ہو اور کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنے میں یہ فائدہ ہو کہ اس کی فقہ جاننا آسان ہو تو اس صورت میں دوسرا مذہب اختیار کرنا اور اپنا پہلا مذہب ترک کر دینا واجب ہے کیونکہ کسی مذہب میں تفقہ اس سے بہتر ہے کہ وہ جاہل رہے۔[۱]

۳. تیسری حالت یہ ہوتی ہے کہ مذہب کا ترک کرنا بغیر کسی قصد و ارادہ کے ہو، اس میں نہ دنیاوی اور نہ دینی مفاد شامل ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عامی کے لیے جائز اور فقیہ کے لئے مکروہ ہے۔[۲]

کتب تاریخ، تراجم اور طبقات میں کئی ایسے مشہور فقہاء کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کیا ہے، مثلاً:

- ابراہیم بن خالد البغدادی الخزاعی پہلے مسلک مالکیہ پر تھے بعد میں شافعی ہو گئے۔
- ابن عبد الحکم پہلے مالکی پھر شافعی اور آخر میں دوبارہ مذہب مالکی کی طرف آ گئے۔
- امام طحاوی پہلے شافعی بعد میں حنفی بن گئے۔[۳]

ان تمام فقہاء نے تحقیق کے بعد مکمل شرحِ صدر کے ساتھ دوسرا مسلک اختیار کیا تھا لیکن تاریخ میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنے گذشتہ مذہب کو باطل قرار دیا ہو۔ یہی وہ لوگ تھے جو تعصب سے پاک تھے۔

فقہاء نے اپنے مذہب سے جزئی طور پر خروج کے لیے شرائط رکھی ہیں جن میں چند اہم یہ ہیں:

۱۔ خروج محض آسان حکم پر عمل کرنے کے لیے اور خواہش کے تابع نہ ہو۔
۲۔ دوسرے مذہب پر عمل کرنے کے لیے انشراح صدر حاصل ہو۔
۳۔ خروج ایسے مسئلہ کے لیے نہ ہو جس کے بارے میں قاضی نے حکم جاری کیا ہو۔
۴۔ خروج کسی ایسے مسئلہ کے لئے نہ ہو جس کے بارے میں فتویٰ صادر ہوا ہو۔

---

(۱) ایضاً
(۲) ایضاً
(۳) سیوطی، جلال الدین عبد الرحمٰن، اختلاف المذاهب، دار النصر للطباعۃ الاسلامیۃ، قاہرہ، ص:۵۵، ۵۴

۵۔ مذاہب اربعہ کے علاوہ خروج نہ ہو۔[۱]

مسلکی تعصب

عصر حاضر میں مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً 1.8 بلین ہے یہ موجودہ دنیا کی آبادی کا چوبیس اعشاریہ ایک فی صد ہے۔[۲] ہر مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی مسلکی گروہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ کوئی دیوبندی ہے تو کوئی بریلوی ہے کوئی غیر مقلد ہے، تو کوئی کسی مسلک کی طرف خود کو منسوب کرنا پسند نہیں کرتا۔ جو مسلمان جس مسلک کے ساتھ وابستگی رکھتا ہے تو اسے یہ اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ وابستہ ہے۔ حقیقت میں یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ اب اگر یہ شخص سمجھتا ہے کہ جو لوگ دیگر مسالک کے پیروکار ہیں وہ باطل پر ہیں تو اس قسم کے خیالات اور رویوں کو مسلکی تعصب کا نام دیا جاسکتا ہے۔

یعنی اپنے آپ کو حق پر سمجھنا اور دوسرے کو باطل قرار دینا۔ اکثر یہ طرز عمل فرد کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ ان کو دوران تعلیم یہ سکھایا جاتا ہے کہ حق وہ ہے جو ہم پڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلاں قسم کی کتاب یا تعلیم حاصل کی تو گمراہی کا خطرہ ہے۔ اگرچہ وہ کتاب حقیقت میں مبنی بر حق ہو لیکن صرف مسلکی وابستگی کی وجہ سے اسے باطل قرار دیا جاتا ہے۔

مسلکی تعصب کے اسباب

مسلکی تعصب کے اسباب درج ذیل ہو سکتے ہیں:

خواہشات کی پیروی

قرآن و سنت یا شریعت کے مقابلہ میں اپنی بات پر ڈٹ جانا خواہش کی پیروی ہوتی ہے اور یہ تعصب کے اہم اسباب میں سے ہے۔ اس قسم کا بندہ کبھی بھی حق کی تابعداری نہیں کرتا اگرچہ اس کے سامنے ہزار ہاں حق کے دلائل رکھے جائیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾[۳]

بھلا بتاؤ جس شخص نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہو، تو (اے پیغمبر) کیا تم اس کی ذمہ داری لے سکتے ہو؟

دنیاوی اور ذاتی مفادات کا حصول

اگر کسی کی تمام جدوجہد اس بات پر مبنی ہو کہ وہ دنیاوی اور ذاتی فوائد حاصل کرے تو پھر وہ کبھی بھی حق کو حق

---

(۱) عبد الفتاح، التمذهب، ص: ۱۸۲

(۲) en.wikipedia.org, Retrieved on 18-01-2019

(۳) سورۃ الفرقان: ۴۳

اور باطل کو باطل نہیں کہتا اور نہ وہ اپنی غلطی کی پرواہ کرتا ہے اور نہ دوسرے کے حق پر ہونے کو کوئی وقعت دیتا ہے۔

اندھی تقلید

اندھی تقلید کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اگر کسی مسلک یا جماعت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور ساتھ یہ بھی پختہ یقین رکھتا ہے کہ جن کے ساتھ میرا تعلق اور لگاؤ ہے وہ کبھی بھی غلطی نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی رائے اور دلیل غلط ہو سکتی ہے۔ اس بندے میں ضرور دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے لیے تعصب پیدا ہو گا۔ کیوں کہ اس کو یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ جس کی وہ پیروی کرتا ہے وہ ہمیشہ حق پر قائم ہوتا ہے اور اس سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ ناممکن ہے کیوں کہ عصمت کامل انبیاء کا خاصہ ہے جیسا کہ امام مالک کا قول ہے:

"كل أحد يؤخذ منه ويرد عليه"(۱)

ہر ایک مواخذہ کیا جائے گا اور جواب طلب کیا جائے گا۔

کم فہمی کے سبب دوسرے کی بات کو اہمیت نہ دینا

جب کسی کو مسئلہ کی حقیقت معلوم نہ ہو تو وہ اس جہالت کی وجہ سے دوسروں کی بات کو اہمیت نہیں دیتا تب یہ جا کے تعصب پر ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت کو جاننے کے بجائے سنی سنائی باتوں پر مخاطب سے بحث کرتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ میں تعصب

ہمارے ہاں بھی تعصب کا یہی مفہوم پایا جاتا ہے چنانچہ اس سے مراد منفی، ناپسندیدہ اور انتہائی سخت رویہ لیا جاتا ہے نتیجتاً انسان کسی دلیل کے بغیر کسی بھی مسئلے کا دفاع اور پیروی کرتا ہے۔ جب کوئی کسی کی بے جا رعایت اور حمایت کرتا ہے تو یہی ان کا ایک غیر متوازن رویہ اور اخلاق ہوتا ہے۔ جس کے باعث اسے متعصب کہا جاتا ہے۔

ذیل میں پاکستانی معاشرہ میں تعصب کے حوالے سے پائے جانے والے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے تعصب کے بارے میں ہمارے رویوں اور رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

کیا مسلکی اشاعت درست ہے؟

پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں مسلک کی ترویج و اشاعت کرنا درست ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مقالہ ہذا میں مسالک سے مراد مذاہبِ اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد ہمارے معاشرے میں موجود مسالک دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مراد ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ مسالک کی ترویج و اشاعت درست نہیں ہے کیوں کہ پاکستان کے مسلمانوں نے اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے ایک مسلک اور راستہ کا انتخاب کر لیا ہے اور ان کا معمول بہ طریقہ

(۱) آلوسی، عماد الدین، جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین، مطبعۃ المدنی، ۱۹۸۱ء، ۱/ ۱۶۰

ٹھیک بھی ہے تو اس اب اس بات کی ضرورت بالکل نہیں رہتی کہ کوئی شخص ان کے درمیان اپنے مسلک کی اشاعت شروع کر دے۔

جب ایک علاقہ کے لوگ ابتداء ہی سے ایک مسلک پر عمل پیرا ہیں تو ان کے درمیان کسی دوسرے مسلک کی اچانک اشاعت شروع ہو جائے تو ان لوگوں میں لازماً اختلاف پیدا ہو گا اور ان کی وحدت تقسیم ہو جائے گی جس کا نتیجہ امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھرنے کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی خاص مسلک کے حامل فرد کو مسلک کی اشاعت کی خاطر بلاضرورت مسجد کا پیش امام یا خطیب بنایا جاتا ہے۔

کیا دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کو بطورِ امام متعین کرنے کی مخالفت تعصب ہے؟

یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ایسے علاقہ کی مسجد میں، جہاں کے لوگ ایک خاص مسلک کے وابستگی رکھتے ہوں، کسی دوسرے مسلک کے ساتھ وابستگی رکھنے والے فرد کو امام یا خطیب بنانا درست ہو گا؟ نیز اگر ایسے شخص کے بطورِ امام یا خطیب تعیّن کی مخالفت کی جائے تو کیا یہ مخالفت تعصب ہو گی یا نہیں؟

مذکورہ سوالات میں سے دوسرے سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب کے تعین میں مددگار ثابت ہو گا، اس لئے دوسرے سوال پر بحث کی جاتی ہے۔ واضح رہے یہ کوئی باقاعدہ فتوی نہیں، محض اصول و قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئی اپنی رائے کا اظہار ہے، جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور مزید بحث کی جاسکتی ہے۔

کسی "**دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کی بطورِ امام تعیناتی کو روکنے کو تعصب قرار دینے**" کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں:

- تعیناتی کی موافقت کی جائے اور اسے عدمِ تعصب قرار دیا جائے۔
- تعیناتی کی مخالفت کی جائے اور اس مخالفت کو تعصب قرار دیا جائے۔

تعیناتی کی موافقت بالاتفاق تعصب قرار نہیں دی جاسکتی البتہ مخالفت کے بارے میں دو آراء ہیں:

۱۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہ تعصب کا عملی اظہار ہے کیوں کہ مذکورہ شخص جب ایک ایسے مسلک سے تعلق رکھتا ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ ہے تو اسے بھی نماز پڑھانے کی اجازت ہونی چاہیئے، نماز پڑھانے کی اجازت نہ دینا اور بطور امام تعیّن کی مخالفت کرنا بجا طور پر مسلکی تعصب کے ضمن میں آتا ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ مخالفت تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ مبنی بر مصلحت ہے کیوں کہ دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کا بطورِ امام تقرّر اختلاف کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا اختلاف سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کو امام نہ بنایا جائے ورنہ اس علاقہ میں انتشار و افتراق کی فضا پیدا ہو جائے گی۔

مذکورہ بالا دونوں آراء میں سے دوسری رائے زیادہ صائب نظر آتی ہے کیوں کہ دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کی بطورِ امام تعیناتی کی مخالفت تعصب نہیں ہے کیوں کہ عوامی حلقوں میں لوگ عموماً اپنے امام ہی کے مسلک کو

درست سمجھتے ہیں اور جب ان کے کانوں میں کوئی ایسی بات پڑ جاتی ہے جو ان کے معمول بہ امور سے ہٹ کر ہو تو وہ اس کی انتہائی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں اور اہلِ علاقہ واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس صورتحال کا مشاہدہ بارہا کیا جا چکا ہے اور اس کے نقصانات بھی عیاں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی مدِ نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضرت ﷺ نے اختلاف کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی ہے اس لئے ایسے معاملات میں پڑنے سے اجتناب ہی بہتر ہے جو اختلاف کا باعث بن سکتے ہیں۔

کیا دینی مدارس میں دوسرے مسلک کے افراد کے داخلوں پر پابندی تعصب ہے؟

یہاں سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان میں موجود مختلف مکاتبِ فکر کے بورڈز سے الحاق شدہ دینی مدارسِ میں دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کو داخلہ نہ دیا جانا تعصب کے ضمن میں آئے گا یا نہیں؟

اس بارے میں بھی مثبت اور منفی دونوں آراء پائی جاتی ہیں اور ہر فریق اس کے اثبات اور نفی میں دلائل دیتے ہیں لیکن مقالہ نگار کی ادنی رائے کے مطابق کہ یہ صورت تعصب میں داخل ہو گی کیوں کہ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی ادارے میں تعلیم حاصل کرے۔ اگر تعلیمی اداروں میں مسلک کی بنیاد ہر داخلہ دیا جانے لگے تو اس سے مسلکی تعصب اور منافرت کو مزید ہوا ملتی ہے کیوں کہ جب تک کوئی شخص دوسرے مسلک سے وابستہ افراد سے گھل مل کر ان کے عقائد و نظریات کے بارے میں جانے گا ہی نہیں، تو "میرا مسلک ہی حق پر ہے" کی سوچ اس کے دماغ سے ہمہ وقت پیوست رہے گی جو ادارے سے باہر نکلنے کے بعد مذہبی اور مسلکی تعصب کی شدت کو بڑھاوا دینے کا باعث بنتی ہے۔ نیز غیر مسلک کا طالب علم خود چل کر آپ کے مسلک سے وابستہ ادارے میں آرہا ہے تو اس کی تو حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ آپ (بذعمِ خود) اپنے صحیح مسلک کو اس اس کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ مدارسِ دینیہ علوم کے مراکز ہیں، یہاں کا علمی ماحول معاشرے کے عمومی حالات سے مختلف ہوتا ہے۔ اہلِ مدارس یہ بات جانتے ہیں کہ دیگر مسالک بھی برحق ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم بھی کرتے ہیں، پھر داخلہ نہ دینا تعصب ہی شمار ہو گا۔

علمی ادارہ میں داخلہ، امام مسجد کی تعیین جیسے انتظامی امر سے اس لیے بھی جدا ہے کہ مسجد میں عوام الناس کا معاملہ اور واسطہ ہوتا ہے، جب کہ یہاں معاملہ علمی حلقوں اور علمی اداروں کا ہے۔ علمی اداریں اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ اختلاف کے آداب و حدود کو سمجھ سکیں اور اختلافی مسائل پر بحث کے قواعد و ضوابط کا ادراک رکھ سکیں، اس صورتِ حال میں پھر بھی دوسرے مسلک والے کو داخلہ نہ دینا، محض انتظامی امر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح پاکستانی معاشرے میں مختلف اداروں میں ملازمت کے حصول کے دوران بھی اکثر و بیشتر مسلکی تعصب آڑے آتا ہے۔ اگر دوسرے مسلک سے وابستہ فرد کو نوکری مل بھی جائے تو اس کے ساتھ سوتیلوں کا سا

سلوک کیا جاتا ہے۔ پاکستانی جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبہ، اساتذہ اور عام ملازمین کے ساتھ مسلکی بنیادوں پر امتیازی سلوک کرنے کے واقعات اکثر اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

درج بالا تمام احوال کو مدِ نظر رکھا جائے تو کسی ایک مسلک کو ترجیح دینا تعصب ہی ہے کیوں کہ نہ تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی پاکستان کا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی شخص کو صرف مسلکی بنیاد پر اہل یا نااہل قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جائے۔

خلاصہ بحث

اہلِ لغت اور اہلِ علم دونوں کی تعریفات کی روشنی میں تعصب کے مفہوم میں شدت اور انتہائی سختی کا معنی پایا جاتا ہے چنانچہ تعصبِ مذہبی کا مطلب بھی یہی ہے کہ کوئی فرد اتنا متشدد اور سخت واقع ہوا ہو کہ وہ ہمیشہ اپنے موقف کو حق اور دوسرے کی رائے کو بلا دلیل غلط قرار دے رہا ہو۔ محمد الغزالی اور ڈاکٹر عبد اللہ بن سلیمان المشوخی کے نزدیک تعصب مذموم اور ممدوح دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ کسی شخص کا مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہونا تمذہب اور تصلّب کہلاتا ہے۔

فقہاء نے اپنے مسلک کو ترک کر کے دوسرے مسلک کو اختیار کرنا چند شرائط اور حالات میں جائز قرار دیا ہے۔

اپنے آپ کو حق پر اور دوسرے کو بلا دلیل باطل قرار دینا مسلکی تعصب ہوتا ہے۔ خواہشات کی پیروی، لا علمی، مفادات کا حصول اور اندھی تقلید مسلکی تعصب کی وجوہات ہیں۔

پاکستان میں مسلکی تعصب کے پروان چڑھانے میں غیر ضروری طور پر اپنے مسلک کی اشاعت اور ترویج مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں اگر کوئی غیر مسالک کی مساجد میں خطیب یا امام مقرر ہونا چاہتا ہے تو اسے سختی سے منع کرنا چاہیئے کیوں کہ یہ مسلکی تعصب کے زمرے میں نہیں آتا جبکہ دینی مدارس میں غیر مسلک کے طلباء کو داخلہ نہ دینا مسلکی تعصب ہوتا ہے۔

اسی طرح جدید عصری اداروں اور جامعات میں بھی طلباء، اساتذہ اور عام ملازمین کے ساتھ مسلکی تعصب کی وجہ سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ تعصب کی اقسام (مذموم و ممدوح) کو ختم کر کے تعصب، تمذہب اور تصلّب کی اصطلاح کا استعمال کیا جائے تاکہ ہر کوئی تعصبِ ممدوح کی آڑ میں غیر مسالک کے پیروکاروں کے ساتھ مسلکی تعصب سے باز آجائے۔

علم نظم قرآن، ارتقاءاور اس کے فوائد و ثمرات

کلثوم بی بی *
پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید عباسی **

ABSTRACT

One of the principles of the Qur'an is the knowledge of the Qur'an, which is based on the principle behind the order of the Quran.Knowledge Poetry is one of the most important knowledge of the Quran. Which means to relate the connection and relation found in the words, verses and Surahs of the Holy Qur'an, that is, the verses of the Qur'an itself have beauty and charm and it is also a structured and integrated word. Which the Lord of the Worlds sent down to guide people. This knowledge is also remembered in connection with the verses, theories, theories, and the names of the adjectives. Understandably, its usefulness in the Qur'an is Muslim, because the Qur'an is a universal message, the universality of this message and the universality of the message and the verses of the Qur'an are twisted because when we interpret the Qur'an itself with its internal words and idioms, if you do, it will be easier to understand

Knowledge of the Qur'an is not just a literal knowledge that has nothing to do with practical life and is not only a reason for the increase of information, but it is a milestone for understanding the Quranic meaning and the Qur'an. The sheer number of greatness and virtues can never be understood by mere sight of this knowledge. This knowledge is also a central source of connection with the Qur'an and the key to understanding the Qur'anic message. Therefore, we can say that the importance of this knowledge has increased greatly in contemporary commentary and interpretation of the Quran and with the help of it we can eliminate many jurisprudence and professional differences.

* ریسرچ اسکالر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
** صدر شعبہ قرآن و تفسیر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

نظم قرآن کا مفہوم

نظم کا لغوی معنی

علامہ ابن منظور لفظ نظم کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"النظم التاليف...نظمت اللؤلؤ اى جمعته فى السلك، والتنظيم مثله...وكل شيى قرنته بآخر أو ضممت بعضه الى بعض فقد نظمته"(۱)

نظم کا مطلب پرونا ہے جب کہا جائے "نظمت اللؤلؤ" تو اس کا مطلب ہے میں نے موتی کو دھاگے میں جمع کیا اور اسی معنی میں تنظیم کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جسے تو کسی اور چیز کے ساتھ ملا دے یا اس کے کچھ حصے سے جوڑ دے تو اس کو نظم کہا جائے گا۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی لفظ نظم کے لغوی معنی یوں بیان کرتے ہیں:

"النظم التاليف وضم شىء الى شىء آخر ونظم اللؤلؤ ينظمه نظام و نظمه الفه وجمعه فيسلك فانتظم وتنظم والنظام كل خيط ينظم به اللؤلؤ ونحوه"(۲)

نظم کے معنی ہیں جوڑنا اور کسی چیز کو دوسری چیز سے ملانا۔ نظم ا اللؤلؤ ينظمه نظما و نظمه کے معنی ہیں کسی دھاگے میں اس طرح موتیوں کو پرونا کہ ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں اور نظام اس دھاگے کو کہتے ہیں جس میں موتی اور اس طرح کی چیزیں پروئی جاتی ہیں۔

نظم کے لغوی معانی میں یہ مفہوم زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے کہ نظم دراصل دھاگے یا اس قسم کی چیز کو کہتے ہیں جس میں موتی پروئے جائیں۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

هل هملت عيناي فى الدار غدوة بدمع كنظم اللؤلؤ المتهالك(۳)

صبح سویرے ہی گھر میں میری آنکھوں نے ایسے آنسو بہانا شروع کر دیے جیسے کسی لڑی سے موتی گرتے ہیں۔

گویا نظم کا لغوی معنی باہم ملانا، ترتیب دینا، منسلک کرنا ہے اور موتی کو لڑی میں پرونا وغیرہ ہے۔ اسی طرح تنظیم کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ہر وہ چیز جو آپ کسی چیز کے ساتھ جوڑ دیں یا اس کے بعض حصے کو بعض کے ساتھ ملا دیں تو اسے نظم کہا جائے گا۔ نظام وہ دھاگہ یا چیز ہے جس میں موتی یا کسی اور چیز کو پرو دیا جائے، اسی طرح نظام کے معنی طریق کار اور عادت کے بھی آتے ہیں۔ ان کے معاملے میں کوئی نظام نہیں، یعنی ان کے معاملہ میں کوئی سلیقہ، ربط اور درستی نہیں۔

---

(۱) ابن منظور، افریقی، محمد بن مکرم، لسان العرب، مادہ نظم، داراحیاء التراث العربی، بیروت

(۲) فیروزآبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، دار الحدیث القاہرہ، ۴/ ۱۴

(۳) ابو تمام، حبیب الرحمن اوس الطائی، دیوان الحماسہ مع شرح تبریزی، دار القلم، بیروت، ۲/ ۱۰۶

نظم کا اصطلاحی مفہوم

علامہ شریف جرجانی نظم کی اصطلاحی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

"تالیف الکلمات والجمل مرتبة المعانی متناسبة الدلالات علی حسب ما یقتضیه العقل"(۱)

مرتب معانی اور متناسب دلالات والے کلموں اور جملوں کو عقلی تقاضوں کے مطابق جوڑنا۔

فلسفہ نظم قرآن کے منفرد شارح اور ترجمان علامہ حمید الدین فراہی(۲) نظم کے لیے نظام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ آپ نظم کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرادنا بالنظام ان تکون السورة کاملا واحدا ثم تکون ذات مناسبة بالسورة السابقة واللاحقة او بالتی قبلها وبعدها علی بعد ما کما قدمنا فی نظم الآیات بعضها مع بعض فکما ان الآیات ربما تکون معترضة فکذلك ربما تکون السور معترضة وعلی هذا الاصل تری القرآن کله کلاما واحدا ذا مناسبة وترتیب فی اجزائه من الاول"(۳)

نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ پوری سورہ ایک مکمل وحدت کی صورت میں ظاہر ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ سورہ یا تو اپنے ماقبل ومابعد سورتوں سے مناسبت رکھتی ہو، جیسا کہ بعض آیات کے بعض آیات کے ساتھ نظم کے سلسلہ میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ چنانچہ جس طرح بعض آیات بطور جملہ معترضہ آجاتی ہیں اس طرح بعض سورتیں بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پورا قرآن ایک وحدت نظر آئے گا جس کے جملہ اجزا میں شروع سے آخر تک ایک خاص طرح کی مناسبت اور ترتیب پائی جاتی ہے۔

نظم کے مترادفات

اصطلاحی معنی میں نظم کا لفظ مناسبت کے مترادفات کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی نظم القرآن اور مناسبات القرآن کی اصطلاحیں مترادفات کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ مفسرین کے نزدیک نظم اور مناسبت ایک دوسرے کے مترادف ہیں امام سیوطی اور امام زرکشی نے اس علم کے لیے نظم قرآن اور علم المناسبۃ کی

---

(۱) جرجانی، علی بن محمد بن علی، کتاب التعریفات، باب نون، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول: ۱۹۸۳ء، ص: ۲۴۲،

(۲) آپ ۱۲۸۰ھ میں ضلع اعظم گڑھ یو۔پی۔ بھارت کے ایک گاؤں پہریہا میں پیدا ہوئے۔ ان کا ایک نام عبد الحمید بھی تھا۔ ابتدائی تعلیم علامہ شبلی نعمانی سے حاصل کی۔ پھر لکھنؤ اور لاہور گئے، بہت بڑے مفسر اور شاعر تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں دلائل النظام اور الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح شامل ہیں آپ ۱۳۴۹ھ میں فوت ہوئے۔ (اصلاحی، مولانا امین احسن، مقدمہ تفاسیر فراہی، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۴)

(۳) فراہی، عبد الحمید، رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ، طبع سوم: ۲۰۰۵ء، ص: ۸۷

اصطلاح استعمال کی ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس علم کے دیگر مترادفات بھی ہیں جن میں سے زیادہ مشہور تناسق وتوافق اور ربط قرآن قابل ذکر ہیں۔

نظم قرآن کا آغاز وارتقاء

علم نظم قرآن اور ربط و مناسبت کی اساسیات دیگر علوم شرعیہ کی طرح قرونِ اولیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس دور میں دیگر علوم کی طرح اس علم کو بھی منظم طور پر بیان کرنے کا نہ داعیہ موجود تھا اور نہ ہی اسے مرتب کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ مجید کی آیات مبارکات کو توقیفی ترتیب سے لکھوا دیا تھا، آپ ﷺ کا صحابہ کرام کو فرمایا:

"ضعوا هذه الآية فى السورة التى يذكر كذا وكذا"(۱)

ان آیات کو اس آیت سے پہلے اور اس آیت کے بعد لکھ دیں۔

جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آیات کو آیات کے باہم پیوست کرنے میں کوئی حکمت ضرور پنہاں ہے، اور علم ربط و مناسبت اسی حکمت کے اظہار کا نام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ مجید کو باہم مربوط ہی پڑھا، لکھا اور سیکھا تھا، علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے:

"ان الصحابة حفظوا و درسوا القرآن وفق نفس الترتيب الذى عينه الرسول صلى الله عليه وسلم"(۲)

یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو یاد کیا اور پڑھا جو نبی کریم ﷺ نے لکھوائی تھی۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا جو علم نظم قرآن کے لیے نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"اذا حدثت عن الله حديثا فقف حتى تنظر ما قبله، وما بعده"(۳)

جب تم اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات منسوب کرو تو اس کے بعد ما قبل اور ما بعد پر غور کر لو۔

اگر ہم عہد تابعین کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی مباحث زیادہ تر تفسیری احادیث و آثار، اور اقوال صحابہ تک محدود تھیں جو فقہی احکام اور اسبابِ نزول سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مباحث کا دائرہ وسیع ہوا اور لغت و معانی پر بحث ہونے لگی۔ اسی طرح قصص قرآنی کی تشریح میں اسرائیلی روایات بھی تفسیری ذخیرے کا حصہ بنیں۔

بنو امیہ کے عہد میں جو کتب تصنیف ہوئیں ان میں نقل پر اعتماد نمایاں تھا۔ بنو عباس کے عروج کے ساتھ

---

(۱) احمد بن محمد بن حنبل، مسند احمد، دار المعارف، للطباعۃ والنشر، ۱۹۴۹، ۱/ ۵۴

(۲) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، دار الفجر للتراث، قاہرہ، ۱۴۲۷ھ، ۱/ ۹۹

(۳) ابن کثیر، عماد الدین، عمدۃ التفسیر، احمد محمد شاکر، دار المعارف، مصر، ۱/ ۴۸

عرب و عجم کے اختلاط میں اضافہ ہوا تو مختلف ثقافتوں سے عربی فکر متاثر ہوئی اور ادبا میں وسعت نظر اور عقلیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا، اسی طرح اہل تفسیر بھی قرآنِ مجید کے ادبی جمال اور معنوی محاسن کو اجاگر کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور تفسیری کتب کی تصنیف کا انداز بدلا۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں معتزلہ کے ایک امام ابراہیم نظام (م ۲۲۲ھ) نے اعجاز قرآن کی بحث میں دلیل صرفہ پیش کی جس کی تردید میں اس کے شاگرد جاحظ (م۲۵۵) نے نظم القرآن لکھی اور قرآنِ مجید کے اسلوب بلاغت کو معجزہ قرار دیا۔ اس کا ذکر خود جاحظ نے اپنی دیگر کتابوں میں کیا ہے، ایک جگہ جاحظ لکھتے ہیں:

"تم نے نظم قرآن پر حجت قائم کرنے کے لیے میری کتاب کی عجیب تالیف اور اس کی خوش نما ترکیب پر عیب جوئی کی ہے۔"(۱)

ابن خیاط معتزلی نے جاحظ کی کتاب کے بارے میں کہا:

"جاحظ کی کتاب کے علاوہ نظم قرآن کے لیے حجت اور اس کی عجیب تالیف میں کوئی کتاب معروف نہیں ہے۔ وہ محمد ﷺ کے لیے ان کی نبوت کی حجت ہے۔"(۲)

ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں:

"غالباً جاحظ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے قرآنِ مجید کے بلاغی اعجاز پر کتاب لکھی، اس کی تائید میں اور ادیبوں نے بھی قلم اٹھایا"(۳)

ابن الندیم محمد بن اسحاق نے نظم القرآن کے حوالے سے دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ نظم القرآن از ابن الاخشید، اور محمد بن یزید واسطی کی "اعجاز القرآن فی نظمہ و تالیفہ" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ہم تک نہیں پہنچیں۔(۴)

۲۔ حسن بن علی بن نصر طوسی کی کتاب نظم القرآن جو ہم تک نہیں پہنچی۔(۵)

ابو علی حسن بن یحییٰ بن نصر جرجانی کی دو جلدوں میں "نظم القرآن"(۶) اور عبداللہ بن ابی داود سلیمان سجستانی کی نظم

---

(۱) جاحظ، عمرو بن بحر، الحیوان، تحقیق عبدالسلام ہارون، قاہرہ، مصر، ۱۹۳۸ء، ۱/۹

(۲) ابن خیاط، الانتصار والرد علی ابن الراوندی الملحد، بیروت، لبنان، ۱۹۵۷، ص:۱۱۱

(۳) شوقی، ضیف، دکتور، البلاغۃ تطور و تاریخ، دار المعارف، قاہرہ، طبع نہم، ص:۵۲

(۴) ابن ندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، تحقیق: رضا تجدد، طہران، ۱۹۷۱ء، ص:۶۳

(۵) داؤدی، محمد بن علی بن حمد، طبقات المفسرین، تحقیق: علی محمد عمر، قاہرہ، مصر، ۱۹۷۲ء، ۱/۱۳۸

(۶) سہمی، حمزہ بن یوسف، تاریخ جرجان، حیدر آباد، ۱۹۶۷ء، ص:۱۸۶

القرآن، کے موضوع پر کتاب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔[۱]

مگر اس موضوع پر جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ ابن قتیبہ کی تاویل مشکل القرآن ہے۔ ان تصانیف سے قرآنِ مجید کے بیانی اعجاز کے دلائل میں بڑا اضافہ ہوا اور اس موضوع پر تالیفات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب علوم کی فن واری تقسیم کے خطوط اپنا نقش جمارہے تھے چنانچہ دوسرے علوم کی طرح قرآنی علوم میں بھی مختلف موضوعات پر تصنیف و تالیف کا رجحان بڑھا۔

اس تصنیف کے بعد یہ فکر عام ہوا کہ قرآنِ مجید کا اصل اعجاز اس کے نظم اور اسلوب بلاغت میں ہے۔ الواسطی کے بعد ابو الحسن علی بن عیسیٰ الرمانی (م ۳۸۴ھ) کی کتاب "النکت فی اعجاز القرآن" سامنے آئی جس میں بلاغی اصولوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا اور قرآنی آیات کی مثالوں سے اعجاز بلاغت کو ثابت کیا گیا۔ الرمانی نے بلاغی اصولوں میں تاثیر نفسی کے نکتہ کا اضافہ کیا اور اسے بلاغت قرآن کا اہم نکتہ قرار دیا۔[۲]

تیسری صدی ہجری کے آخر تک جو کتابیں معرضِ وجود میں آئیں ان میں اعجاز کی بحث ایک خاص نہج سے آگے نہیں تھی۔ قدیم عربی زبان و ادب میں تنقید کی کچھ حدود تھیں، جن کے مطابق کسی تصنیفی کام کے فنی محاسن جانچنے کے لیے ہر جزء کا جداگانہ تجزیہ کیا جاتا تھا اور کلام کی تحسین کل کی بجائے جزء کی روشنی میں کی جاتی تھی۔

قرآنِ مجید کے اعجاز بلاغت کے اثبات کے لیے جو کتب لکھی گئیں ان میں بھی یہی انداز غالب رہا، مگر زبان و ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اُسلوب اور طریق تعبیر ہر دور میں یکساں نہیں رہتا۔ فصاحت و بلاغت کے سانچے بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں، البتہ ہر زبان کے ادب کی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ جنہیں زبان و ادب کی روح کہا جاتا ہے، اور زبان و ادب کی یہ روح قرآن مجید میں ہر دور میں بدرجہ اتم موجود رہی ہے۔

البتہ متقدمین میں سے جن اصحاب علم نے اس سلسلہ میں کلام کیا ہے ان میں تیسری صدی کے امام جاحظ نے اپنی کتاب کا نام "نظم القرآن" رکھا۔ امام ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) نے تاویل مشکل القرآن تالیف کی۔

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی کے آغاز میں تفسیری ادب کے اولین مفسر علامہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) نظم قرآن کے متعلق اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

> "جن بہترین معانی کی بدولت ہماری کتاب (قرآن) ما قبل کی ساری کتابوں سے بڑھ گئی ہے وہ اس کا عجیب و غریب نظم اور شان دار تالیف و ترتیب ہے جس کی ایک چھوٹی سورت کے مثل

---

(۱) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، تحقیق: بشار عواد، معروف دار المغرب الاسلامی، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۱۱/ ۱۳۶

(۲) صبحی صالح، علوم القرآن، ملک سنز، ناشران کتب، فیصل آباد، طبع چہارم: ۱۹۹۴ء، ص: ۴۰۱

پیدا کرنے سے خطبائے زمانہ عاجز اور اس کی تالیف و ترتیب سے شعراء حیرت زدہ رہ گئے "[۱]

چوتھی صدی ہجری کے ربع اول کے ایک محقق شیخ ابو بکر نیشاپوری (م ۳۲۴ھ) کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے آیات اور سورتوں میں مناسبات سے متعلق سوالات اٹھائے اور ان میں باہمی وجوہ اور حکمتوں پر بحث کا دروازہ کھولا اور اس جدید نہج سے قرآنِ مجید کا مطالعہ کرنے پر زور دیا۔ آپ اہل عراق کی اس علم سے غفلت برتنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔

امام زرکشی نے شیخ ابو الحسن شہرابانی کے حوالے سے لکھا ہے:

"اول من أظهر ببغداد علم المناسبة، ولم نكن سمعناه من غيره هو الشيخ الإمام ابو بكر النيسابوری وكان غزير العلم فی الشريعة والأدب، وكان يقول على الكرسی إذا قرأ عليه الآية: لم جعلت هذه الآية إلى جنب هذه الآية؟ وما الحكمة فی جعل هذه السورة إلى جنب هذه السورة؟ وكان يزری على علماء بغداد لعدم علمهم بالمناسبة"[۲]

بغداد میں سب سے پہلے شیخ ابو بکر نیشاپوری (ابو عبداللہ بن محمد بن زیاد) نے علم مناسبات کو ظاہر کیا تھا، جو بڑے ذی علم شخص، شریعت اور ادب کے بڑے ماہر تھے، آپ آیۃ الکرسی کی بابت جب ان کے سامنے پڑھی جاتی یہ کہا کرتے تھے کہ یہ آیت اس آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی؟ اور اس سورۃ کو فلاں سورۃ کے برابر اور پہلو بہ پہلو لانے کی کیا حکمت ہے؟ شیخ مذکور بغداد کے علماء کا اس علم سے غفلت برتنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نظم قرآنی کو بیان فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

"میں نے سورۃ الفاتحہ کی ابتدا سے لے کر سورۃ البقرۃ تک نظم بیان کر دیا ہے کہ قرآنِ مجید نے بسم اللہ سے ابتدا فرمائی پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، دعا اور اس کی طرف رغبت کی تعلیم دی کہ ہم اس ہدایت کے طالب ہوں جو اس کی معرفت، جنت اور رضوان کی طرف لے جانے والی ہے، جو اس راستہ سے جدا ہے جو غضب کے مستحقین اور اس کے شکر، معرفت اور نعمتوں سے گمراہ ہیں، پھر سورۃ البقرۃ میں مومنین کے اوصاف بیان فرمائے، پھر کفار کے اوصاف بیان فرمائے، پھر منافقین کے اور ان کی امثلہ بیان فرمائیں "[۳]

---

(۱) طبری، ابن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، البابی الحلبی، مصر، ۱/ ۶۵

(۲) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ص: ۹۷۶

(۳) جصاص، ابو بکر، ابن العربی، احکام القرآن، دار الفکر، بیروت، ۱/ ۲۱

پانچویں صدی میں امام عبد القاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) نے "دلائل الاعجاز" لکھ کر ثابت کیا کہ بلاغت کلام کا اصل مرجع نظم کلام کے خصائص میں ہے۔

پھر چھٹی صدی ہجری کے دو ممتاز مفسرین نے اس فکر کو وسعت دینے میں خاص توجہ دی، ان میں سے ایک امام زمخشری (م ۵۳۷ھ) ہیں جنھوں نے مناسبات آیات کو بلاغتِ قرآنی کا جز قرار دیا اور اس کے مخفی پہلوؤں کو اپنی کتاب "تفسیر الکشاف" میں بیان کیا۔(۱)

دوسرے محقق قاضی ابو بکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ) ہیں، جو علم مناسبہ کو عظیم علم قرار دیتے ہیں اور وہ پہلے مفسر ہیں جو آیات میں اس درجہ ربط اور پیوستگی کے قائل ہیں کہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کلمہ واحدہ کی مانند ہے جس میں آیات باہم وحدتِ بسیط کی طرح مربوط ہیں۔

امام زرکشی نے بیان کیا ہے کہ امام ابن العربی نے اپنی کتاب "سراج المریدین" میں لکھا ہے:

"ارتباط آی القرآن بعضها ببعض حتى تكون كالكلمة الواحدة، متسقة المعانى، منتظمة المبانى علم عظيم، لم يتعرض له إلا عالم واحد عمل فيه سورة البقرة، ثم فتح الله عزوجل لنا، فلما لم نجد له حملة ورأينا الخلق بأوصاف البطلة ختمنا عليه، وجعلناه بيننا وبين الله، ورددناه اليه"(۲)

قرآنِ مجید کی آیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ یوں ربط دینا کہ وہ سب مل کر ایک باہم مناسبت رکھنے والے الفاظ اور مسلسل معانی کا ایک کلمہ ہو جائے۔ نہایت شریف اور عظیم علم ہے اور بجز ایک عالم کے کسی نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے، انھوں نے بھی سورۃ البقرۃ میں اس کو استعمال کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ دروازہ ہم پر کھول دیا مگر جب ہم نے اس کے واسطے کوئی اٹھانے والا شخص نہیں پایا۔ تمام خلق کو سست و کاہل لوگوں کی طرح دیکھا تو اس بحث کو مہر کر کے تہہ کر رکھا اور یہ رمز اپنے اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہی تک محدود رکھا اور اسی کی طرف لوٹا دیا۔

علم نظم قرآن اور ربط و مناسبت کی سب سے زیادہ اہمیت امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی تفسیر مفاتیح الغیب سے حاصل ہوئی، جس میں نظم و ربط آیات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور جملوں کی تقدیم و تاخیر، صیغوں کے اختلاف اور الفاظ کے وصل و فصل کے معمولی فرق سے بے شمار اسرار و رموز بے نقاب کیے گئے۔ امام رازی ترتیب اور نظم آیات کو الفاظ و معانی کی طرح معجزہ قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جو لوگ قرآنِ مجید کے اُسلوب کو معجزہ قرار دیتے ہیں اس سے ان کی مراد ترتیب اور نظم آیات ہی کا اعجاز ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر شوقی ضیف، البلاغۃ تطور و تاریخ، دار المعارف، مصر، ص:۲۲۰

(۲) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ص:۹۷۶

چنانچہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ومن تأمل فی لطائف نظم هذه السورة وفی بدائع ترتيبها علم ان القرآن كما أنه معجزه بحسب فصاحة لفاظه و شرف معانيه فهو أيضاً معجز بحسب ترتيبه و نظم آياته ولعل الذين قالوا: إنه معجز بحسب أسلوبه أرادوا ذلك إلا انی رأيت جمهور المفسرين معرضين عن هذه اللطائف غير متنبهين لهذه الأسرار"(۱)

جو شخص اس سورۃ (بقرہ) کے نظم کے لطائف اور اس کی ترتیب کے بدائع میں تامل کرے گا وہ بخوبی معلوم کر لے گا کہ جس طرح پر قرآنِ مجید اپنے الفاظ کی فصاحت اور اپنے معانی کے شرف کے سبب سے معجزہ ہے وہ اپنی ترتیب اور نظم آیات کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے اور شائد کہ جن لوگوں نے قرآنِ مجید کو اُسلوب بیان کی وجہ سے معجزہ ہونا بیان کیا ہے انھوں نے یہی بات مراد لی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی، مگر افسوس کی بات ہے کہ میں نے عام مفسرین کو ان لطائف سے روگردانی کرنے والا اوران اسرار پر توجہ نہ کرنے والا دیکھا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیش رو امام نیشاپوری کی طرح اپنے عہد کے مفسرین کو ملامت کرتے ہیں جو اپنی نظر کی تنگی کے سبب اس علم کی قدر شناسی سے قاصر ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان کی حالت اس شعر کے مطابق ہے:

والنجم تستصغر الأبصارصورته والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر(۲)

نگاہیں ستارے کو چھوٹا دیکھتی ہیں حالانکہ چھوٹا نظر آنے میں قصور نگاہوں کا ہے ستارے کا نہیں۔

ابن العربی (م ۵۴۳ھ) نے اپنی تفسیر کی ابتدا "الحمد الله الذی جعل مناظم كلامه"(۳) "تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنا کلام نظم والا بنایا" سے کی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ نظم قرآن کریم کے زبردست حامی تھے۔

آٹھویں صدی ہجری کے شیخ ابو جعفر بن زبیر غرناطی (م ۷۰۸ھ) نے اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے، جس کا نام "البرهان فی مناسبة ترتيب سور القرآن" ہے۔(۴)

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

"وما السبك فهو ان تتعلق كلمات البيت أو الرسالة أو الخطبة بعضها ببعض من اوله الى آخره ولهذا قيل: خير الكلام المسبوك المحبوك الذی يأخذ بعضه بركاب

---

(۱) رازی، فخر الدین، محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، دار الکتب العلمیہ، طہران، ۷/۱۲۸

(۲) فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، مکتب الاعلام اسلامیۃ، ۱۴۱۱ھ، ۳/۱۰۶

(۳) ابن العربی، محی الدین، احکام القرآن، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیہ، ۱/۳۲۱

(۴) البرہان فی علوم القرآن، ص: ۴۲

بعض، والقرآن العظيم آياته كلها كذلك فا عرفه"[۱]

کلام کا حسن یہ ہے کہ خواہ کوئی شعر ہو، خط ہو یا خطبہ، ان کے کلمات ابتداء سے انتہاء تک ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بہترین کلام وہ ہے جس کے اجزاء باہم دگر آپس میں مربوط ہوں۔ قرآن عظیم کی تمام آیات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں:

"قرآنِ مجید کی ہر سورت کی آیات باہم مربوط ہیں، سورتوں کی ترتیب محکم ہے اور مکمل قرآنِ مجید کلام واحد کی صورت ہے"[۲]

اس صدی میں ہمیں برصغیر میں علامہ علاؤالدین مہائمی (م ۸۳۵ھ) کا نام ملتا ہے، جنھوں نے مناسبات آیات ہی کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر مکمل تفسیر قرآن مرتب فرمائی جس کا نام "تبصیر الرحمان وتیسیر المنان" رکھا۔ اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے یہ تفسیر بے مثل ہے۔ مفسر مہائمی نے اپنی تفسیر میں یہ التزام بھی فرمایا کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ایسے معانی بیان کیے جائیں جن کا اس سورۃ کے مرکزی مضمون سے گہرا تعلق ہو۔ آپ فرماتے ہیں:

"میں نے اپنی تفسیر میں ربط کلمات، نظم وترتیب آیات کے متعلق ایسے نکات اور لطائف جمع کر دیے ہیں جو ان سے پہلے کسی کی دسترس میں نہ آسکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص احسان فرمایا اور انہیں یہ توفیق بخشی کہ نظم قرآن کے مخفی گوشوں کو ظاہر کریں اور ان کے جمال اور اعجاز کو آشکار کریں"[۳]

نویں صدی ہجری کے امام برہان الدین ابن عمر البقاعی (م ۸۸۵ھ) کی اس فن پر لکھی جانے والی ایک اہم کتاب ہے جس کا نام "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" ہے۔، اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کوئی تصنیف نہیں ہے اور یہ قرآنِ مجید کا محیر العقول خزانہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف پر چودہ سال صرف کیے ہیں۔

دسویں صدی ہجری میں امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اس علم کی طرف خاص توجہ دی اور اس علم نے جو وسعت ان کے عہد تک اختیار کی تھی، اس کو سمیٹنے کی اہم خدمت سرانجام دی۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے ربط و مناسبت آیات و سور پر اپنی نوعیت کا منفرد کام کیا ہے، اس موضوع آپ کی

---

(۱) ابن قیم، کتاب الفوائد، دار النشر الکتب الاسلامیہ، پاکستان، ص: ۲۲۴

(۲) شاطبی، ابو اسحاق ابراہیم، الموافقات فی اصول الشریعۃ، تحقیق: عبد اللہ دراز، دار المعرفہ، بیروت، طبع دوم: ۱۹۹۶ء، ۳/۳۶۷

(۳) تبصیر الرحمن وتیسر المنان، ۱/۳

چار کتابیں ہیں۔

۱۔ "قطف الازھارفی کشف الاسرار"، احمد بن محمد الحمادی کی تحقیق سے۔

۲۔ "اسرار ترتیب سور ا لقرآن"، رضی فرج الہامی کی تحقیق سے۔

۳۔ "تناسق الدرر فی تناسب السور"، عبداللہ محمد الدرویش کی تحقیق سے

۴۔ "مراصد المطالع فی تناسب المقاطع والمطالع" دکتور محمد بن عمر بازمول کی تحقیق سے منظر عام پر آچکی ہیں۔

اسی صدی ہجری میں محمد بن احمد خطیب شربینی مصری (م۹۷۷ھ) نے بھی اپنی تفسیر "السراج المنیر فی الاعانة علی معرفة بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر" میں ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا الگ الگ معنی کیا ہے۔

تیرہویں صدی ہجری میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (م۱۲۳۹ھ) کی فارسی زبان میں تفسیر "فتح العزیز" اسرار و حکم اور ربط آیات کا اعلیٰ مخزن قرار دی جاتی ہے۔اسی صدی میں بغداد کے مشہور عالم، سید محمود آلوسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (م۱۲۷۰ھ) نے اپنی تفسیر "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" مرتب فرمائی جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث کی جامع ہے۔علامہ آلوسی نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے۔اس تفسیر میں نظم و ارتباط کو بھی بہترین عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

چودھویں صدی ہجری میں تصانیف میں ایک نیا رنگ ابھرا ہے جسے ہم ادبی اور اجتماعی اسلوب کا نام دے سکتے ہیں، اس طرز تفسیر کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ اس میں پرکشش انداز میں ان مطالب و معانی پر توجہ دی گئی ہے جو قرآن کا اصلی مقصود اور نصب العین ہے، جس میں انسانیت کے اجتماعی اور عمرانی مسائل پر قرآنی نصوص کا انطباق کیا گیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ (م۱۳۵۴ھ) کو اس تفسیری مکتب فکر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔[1] شیخ نے نظم قرآن سے متعلق محیر العقول حقائق کا انکشاف کیا اور ایسے اصول وضع کیے جس سے تفسیری رجحانات میں قابل قدر تبدیلی پیدا ہوئی۔

آپ کے منہاج کو آپ کے شاگردوں میں سے محمد ابن مصطفی مراغی (م۱۳۶۴ھ) نے اپنی تفسیر میں بڑی خوبی سے اپنا لیا۔ آپ کے ایک اور شاگرد ڈاکٹر عبد اللہ دراز کی تیسویں پارے کی تفسیر "النبا العظیم" اس فن میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے جو دارالقلم کویت سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبد اللہ دراز کے تلامذہ میں سے دکتور عبداللہ شحاتہ کی "اھداف کل سورۃ و مقاصدھا فی القرآن الکریم" بھی اس موضوع سے متعلق ہے۔ جو الھئیۃ المصریہ

(۱) ذہبی، محمد حسین، دکتور، تاریخ تفسیر و مفسرین، مترجم: غلام احمد حریری، کشمیر بک ڈپو، فیصل آباد، ۱۹۹۶ء، ص:۶۷۶

کی زیر نگرانی شائع ہو چکی ہے۔ آپ کے تفسیری لیکچروں کو آپ کے شاگرد علامہ محمد رشید رضا (م ۱۳۵۴ھ) قلم بند کرتے تھے اور رسالہ "المنار" میں شائع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سورۃ النساء تک پہنچا تھا کہ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

برصغیر پاک وہند کی اہم شخصیات بھی اس فن میں کسی سے پیچھے نہ تھیں جنھوں نے اس باب میں نہایت اہم خدمات سر انجام دی ہیں جن میں درج ذیل شخصیات قابل ذکر ہیں:

علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا فراہی نظم قرآن کے ماہر اور محرم راز سمجھے جاتے ہیں، آپ نے قرآن مجید فہمی کے سلسلہ میں ربط و مناسبت کے اصولوں کی وضاحت کے لیے دلائل النظام لکھی۔ مولانا کی عمر نے وفا نہ کی اور اپنی اکثر تصانیف کی تکمیل نہ فرما سکے آپ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے آپ کے کام کو آگے بڑھایا اور تدبر قرآن لکھ کر ارتباط اور نظم کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔

آپ نے اپنی عمر کے چالیس سال پوری جاں فشانی کے ساتھ تدبر قرآن پر صرف کیے۔ وہ اپنے عمیق مطالعہ، عبقریت اور ذہانت کی بناء پر اپنے بہت سے معاصرین پر سبقت رکھتے ہیں۔ مولانا کی رائے ہے کہ قرآنِ مجید کی ہر سورۃ کا ایک مرکزی مضمون ہے جو مطالب سورۃ کی شیرازہ بندی کا کام دیتا ہے، اس کے تمام مضامین کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے اور تمام بکھرے ہوئے موتیوں کو جمع کر کے ان سے ایک خوبصورت ہار تیار کر دیتا ہے۔ عمود کا سر رشتہ پوری سورۃ کو کثرت مضامین کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

آپ تمام وجوہ سے قرآنِ مجید کے اعجاز کے قائل ہیں۔ امام ابن العربی اور امام رازی کی طرح آپ نے قرآنی مفردات، ترتیب، ترکیب، اور حقائق و مقاصد اور مناسبات کی بعض دقیق اور مشکل وجوہ کا حل تلاش کیا اور اہم نکات کا اضافہ کیا۔ اس ضمن میں آپ نے "مشکلات القرآن" بھی تحریر فرمائی۔ جسے آپ کے شاگرد مولانا یوسف بنوری نے اضافہ کے ساتھ یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن کے نام سے شائع کیا۔[1]

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں ربط آیات و سور کو خاص اہمیت دی ہے اور اسی خاص موضوع پر آپ نے اُردو میں سبیل النجاح کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر فرمایا اور عربی میں سبق الغایات فی نسق الآیات کے

(۱) بنوری، مولانا یوسف، یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، جمال پریس، دہلی، ص:۶۷

نام سے دوسرا رسالہ تحریر فرمایا[۱]

مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کو ربط آیات وسور پر خصوصی مہارت و امتیاز حاصل ہے اس موضوع پر آپ کی یادگار املائی تصنیف "بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان" ہے جس میں ابتدائے قرآنِ مجید سے آخر تک کی سورتوں کے علیحدہ علیحدہ ارتباط و تناسب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آپ نے چالیس سال سے زائد عرصہ تک تفسیری موضوعات پر غور و فکر فرمایا۔ آپ کے تفسیری امالی آپ کے شاگرد مولانا محمد نذر شاہ عباسی اور شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان نے مرتب کیے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

آپ نے قرآنِ مجید میں نظم کے مسئلہ پر کم و بیش چالیس سال تک غور خوض فرمایا۔ آپ نے شاہ ولی اللہ کی حکمت کی روشنی میں قرآنِ مجید کے چند مقاصد متعین کیے ہیں، پھر ان کے پیش نظر ہر سورۃ کے ایک خاص مرکزی مضمون کا تعین کیا ہے اور اس طرح سورتوں میں تسلسل قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔[۲]

تلامذہ مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہم

مولانا حسین علی کے عظیم اور قابل قدر تلامذہ نے "علم المناسبۃ" سے متعلق کافی کام کیا ہے، جن میں سے کچھ کا تذکرہ ترتیب وفات کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ شیخ التفسیر مولانا محمد امیر بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حسین علی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے آپ نے آیات و سور پر "الدرر المنثور بربط آية بآية وسورةٍ بسورة" تالیف کی ہے جو مکتبہ حسینیہ سیٹلائٹ ٹاون سرگودھا سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

انھوں نے اپنی تفسیر "جواهر القرآن" میں "علم المناسبة" کو نہایت اچھے طریقہ سے استعمال کر کے ہر سورۃ کا ربط، خلاصہ اور مضامین کی تفصیل نہایت دل نشین انداز میں بیان کی ہے۔

۳۔ مولانا محمد طاہر پنج پیری رحمۃ اللہ علیہ

علم المناسبۃ اور ربط آیات و سور اور مطالب و خلاصہ جات سور سے متعلق آپ کی کتاب کا نام "سمط الدرر فی ربط الآیات والسور" ہے۔ ان کی اس فن سے متعلق ایک دوسری نہایت مفید کتاب "اللمعان من خلاصة

---

(۱) تھانوی، مولانا اشرف علی، سبق الغایات فی نسق الآیات، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

(۲) سندھی، عبید اللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص:۱۶

سور القرآن" ہے۔ علاوہ ازیں آپ کی کتاب "العرفان فی اصول القرآن" مذکورہ کتابوں کے اصولوں کی بہترین وضاحت ہے۔

مولانا حسین علی کے براہ راست تلامذہ کے علاوہ چند مزید نام درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا عبدالواحد بن نور محمد

مولانا محمد طاہر پنج پیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند مولانا محمد طیب کے تلمیذ رشید مولانا عبدالواحد نے اپنے استاذ گرامی کے افادات کو "مخ القرآن فی ربط السور والامتیازات من الفرقان" میں جمع کیا ہے جو دار العلوم تعلیم القرآن ضلع صوابی صوبہ سرحد سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ مولانا عبداللہ

مولانا عبداللہ کی کتاب "نظم المرجان فی ارتباط سور القرآن" بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔ آپ ضلع سوات کے علاقے باغ، کے ایک مشہور عالم دین ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب صرف ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے لیکن سورتوں کی نظم و مناسبت میں موجود اسرار و حکم کا خزینہ ہے۔ کتاب کے ناشر اور سن اشاعت کا ذکر نہیں۔ اس کے سٹاکسٹ اشاعت اکیڈمی (قصہ خوانی بازار پشاور) کے مالک ہیں۔

۳۔ سید عبدالسلام رستمی رحمۃ اللہ علیہ

پشاور کے معروف مفسر قرآن علامہ سید عبدالسلام رستمی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآنی سورتوں کے اسماء کی مناسبت پر قابل قدر کتاب "القول المختصر فی ربط اسماءالسور" جسے دار التفسیر جامعہ عربیہ پشاور نے شائع کیا۔

۴۔ علامہ شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

آپ نے اپنی معروف کتاب "علوم القرآن" میں نواں شبہ کے زیر عنوان قرآن کریم کی آخری منزل پر مشتمل اپنی غیر مطبوعہ تفسیر کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے ربط و مناسبت کو بنیاد بناتے ہوئے تفسیر قرآن کی خدمت سرانجام دی ہے۔ یہ تفسیر تاحال شائع نہیں ہو سکی۔

الغرض متقدمین نے نہ صرف یہ کہ اپنی تصنیفات میں نظم قرآن (نظم کلام) کی اصطلاح استعمال کی، بلکہ نظم کلام کو قرآن مجید کے اعجاز کا محل بھی قرار دیا۔ ان کے ہاں نظم قرآن سے مراد یہ تھا کہ قرآن مجید کے محض الفاظ و کلمات ہی معجزانہ حیثیت نہیں رکھتے اور نہ فقط ان کے معانی کا یہ حال ہے، کیونکہ یہی الفاظ و معانی تو عربوں کے ہاں بھی مروج تھے، البتہ ان الفاظ و معانی کی ترکیب سے جو کلام، قرآنی آیات اور قرآنی جملوں کی شکل میں پیش ہوتا تھا، وہ معجزہ تھا اور اس جیسی ترکیب پر مبنی ایک سورت بھی پیش کرنے سے کفار عاجز آ گئے تھے۔ لیکن ان کے ہاں نظم کلام سے مراد وہ مفہوم نہیں تھا جسے متاخرین میں مولانا فراہی و اصلاحی اور دیگر حضرات نے متعارف کروایا ہے۔

نظم قرآن کی ضرورت واہمیت

علوم قرآن کریم میں سے ایک علم نظم قرآن کا ہے جس کی بنیاد قرآن مجید کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر ہے۔ علمِ نظمِ قرآن میں جس طرح آیات کے باہمی ربط و نظم پر بحث کی جاتی ہے اسی طرح سورتوں کے باہمی ربط و نظم پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ گویا نظم قرآن کریم سے مراد قرآن حکیم کے کلمات، آیات اور سورتوں میں پائے جانے والے ربط اور تعلق کو بیان کرنا ہے۔ قرآن کریم کی ہر بات اپنی جگہ تو حسن وجمال اور پیکرِ رعنائی و دلکشی ہے ہی، لیکن یہ اقوالِ زریں کی طرح اکٹھا کیا گیا کوئی کلام نہیں کہ جس کے کلمات، آیات اور سورتوں میں کوئی ربط و تعلق موجود نہ ہو بلکہ پورے قرآن کریم میں ایک گہرا اور قوی تعلق موجود ہے اور ایک محکم ترتیب پر قائم ہے اور یہ ابتدا سے آخر تک اس طرح منظم اور مربوط کلام ہے کہ گویا یہ کلمہ واحدہ ہے۔ قرآن کریم میں موجود اس ربط و تعلق کو بیان کرنا یہاں تک کہ قرآن کریم میں مکمل ہم آہنگی ظاہر ہو اور یہ کلمہ واحدہ کا روپ دھار لے اسی کو اصطلاح میں نظم قرآن کریم یا مناسبات قرآن کریم کہا جاتا ہے اور یہی علم اسی ربط و تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو پورے قرآن کریم میں پایا جاتا ہے۔ الغرض یہ وہ علم ہے جس میں اس چیز سے بحث کی جاتی ہے کہ قرآن کریم کے کلمات، آیات اور سورتوں میں باہمی ربط اور ان کے مابین معنوی ربط کیا ہے۔

قرآنِ کریم جہاں رشد و ہدایت کا منبع ہے تو وہاں فصاحت و بلاغت اور ادبی جمال کا پیکرِ تمام بھی ہے۔ علماءادب و بلاغت کے نزدیک وجوہِ اعجاز قرآنی میں سے بڑی وجہ اعجاز اس میں موجود نظم و مناسبت اورارتباط و ترتیب ہے۔ ایک ہی سورت میں متعدد چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ وعدہ و وعید، بشارت و نذارت، امثال و قصص اور اوامر و نواہی سب چیزیں زیر بحث آتی ہیں لیکن ہر موقع پر ایسی ترتیب اور مناسبت کے ساتھ کہ ایسے نظم و ارتباط کا تصور بھی عقل انسانی سے ماوراء ہے اور سب چیزیں اس جمال و دلکشی سے مربوط بیان کی جاتی ہیں جیسے ایک لڑی میں موتیوں کو پرو دیا گیا ہو اگر ایک لفظ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کلام کا حسن ماند پڑ جائے۔ اس لیے شروع سے آج تک علماء و مفسرین کی ایک کثیر تعداد قرآنِ مجید میں نظم و مناسبت کی قائل رہی ہے، اور انھوں نے مختلف زاویوں سے اس فن میں خدمات سر انجام دیں۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ”قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نظم عمدہ، الفاظ فصیح اور معانی حسین ہیں۔ اس نے توحید کی تعلیم دی، شرک سے اجتناب کی تلقین کی، اطاعتِ الٰہی پر ابھارا، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے ضابطے بتائے، وعظ و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول واضح کئے اور ان ساری تعلیمات کو نظم کی لڑی میں اس طرح منسلک کر دیا کہ ذرا سا دھاگہ ٹوٹا اور سارے موتی منتشر ہو گئے۔ قرآنی بلاغت ادب کے تمام اسالیب کی جامع ہے جس کی نظیر

انسانی وجود پیش نہیں کر سکتا۔ الفاظ کو اس طرح مربوط بنا دیا گیا ہے کہ اگر انہیں ان کے مخصوص مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیا جائے تو مفہوم گڑبڑ ہو جائے یا وہ چاشنی اور رونق باقی نہ رہے جو قرآن میں موجود ہے"(۱)

"علم نظم قرآن" قرآن مجید کا علم کوئی محض ایک لفظی علم نہیں ہے جس کا عملی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو اور وہ فقط معلومات میں اضافے کا ہی سبب ہو بلکہ یہ علم قرآنی مراد کو سمجھنے کیلئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور قرآن کریم کی عظمتوں اور فضائل کے بے پناہ گوشے اس علم سے صرف نظر کر کے کبھی بھی سمجھے نہیں جاسکتے۔ جب بھی کسی کلام کو اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے دیکھا جائے گا تو اس کلام کی مراد اور اس کا مفہوم مبہمات کے پردوں میں گم ہو تا جائے گا اور کسی بھی بات کو اس کے پس منظر میں دیکھنا اس کی مراد سمجھنے کیلئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن مجید کو نظم و مناسبت کی روشنی میں نہ پڑھا جائے تو قرآن مجید کا مقصود نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور مناسبت وارتباط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قرآن مجید کا مطالعہ کرنا قرآن مجید کے اسرار ورموز سے پردہ سرکانے میں خضر راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علم قرآن کریم سے تعلق پیدا کرنے کا مرکزی ذریعہ بھی ہے اور قرآن حکیم کے پیغام کو سمجھنے کی کلیدی ذریعہ بھی ہے۔

قاضی عبد الجبار معتزلی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فصاحت مفرد کلمات میں نہیں ہوتی، بلکہ ایک مخصوص طریقہ کو اختیار کر کے کلام میں نظم و ارتباط پیدا کرنے سے فصاحت پیدا ہوتی ہے۔ نظم و تالیف کے ساتھ ہر لفظ کی ایک صفت ہونی چاہیے۔ یہ صفت بسا اوقات نظم و ترکیب سے اپنا مقام بناتی ہے اور کبھی اعراب کے ذریعہ اور کبھی موقع و محل سے امتیاز حاصل کر لیتی ہے۔ ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھی شکل نہیں ہے"(۲)

"علم نظم قرآن"، قرآن مجید کے خزانوں اور اس کی حکمتوں کی کلید ہے جس طرح یہ قرآن کریم کے اسرار ورموز میں سے ایک راز ہے اسی طرح اس چیز نے قرآن مجید کو ایک ایسا سمندر بنا دیا ہے جس کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور اسے ایک ایسا خزانہ بنا دیا جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس تناظر میں فرماتے ہیں:

"اكثر لطائف القرآن مودعة فی الترتيبات والروابط"(۳)

---

(۱) خطابی، حمد بن محمد، البیان فی اعجاز القرآن، تصحیح: ڈاکٹر عبد العلیم، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، س ن، ص:۹

(۲) اسد آبادی، عبد الجبار، المغنی فی ابواب التوحید والعدل، وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، ایران، ۱۲/ ۲۰۰، ۱۱۹

(۳) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ۳/ ۲۷۳

قرآن مجید کے اکثر لطائف اس کی ترتیب اور نظم وارتباط میں پنہاں ہیں۔

قرآن مجید میں مختلف قسم کا بیان مثلاً ایمان و کفر، وعدہ و وعید، حالات و واقعات، قصص و مواعظ، تبشیر و انذار، اور تعمیر شخصیت کے متعدد گوشے پہلو بہ پہلو بیان کئے جاتے ہیں۔ ان مختلف چیزوں کو اکٹھا بیان کرنے میں کہیں بھی نظم وارتباط میں خلل نہیں پڑتا۔ سب کچھ اتنی خوبصورت مناسبت وارتباط سے بیان کیا جاتا ہے کہ عقل انسانی ششدر رہ جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے قرآن کریم جیسا نظم وارتباط بشری استعداد سے ماوراہے اور یہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔ قرآن کریم کی وجوہ اعجاز میں ایک اہم وجہ قرآن کریم کی مناسبت اور اس کا ارتباط بھی ہے۔ اسی لیے جاحظ نے اپنی کتاب نظم القرآن میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز اس کی نظم و مناسبت میں پوشیدہ ہے۔[۱]

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ ﴿آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ اِلَيهِ مِنْ رَّبِّه وَ الْمُؤْمِنُوْنَ...﴾[۲] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> "جو اس سورۃ کے نظم و مناسبت اور اس کی ترتیب کے حسن میں غور کرے گا وہ اس بات کو جان لے گا کہ قرآن مجید جیسے فصاحت الفاظ اور شرف معانی میں معجزہ ہے وہ اسی طرح اپنی ترتیب اور نظم آیات میں بھی معجزہ ہے اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ قرآن مجید اپنے اسلوب کے اعتبار سے معجزہ ہے تو اسلوب سے ان کی مراد خواہ نظم وارتباط ہی ہو"[۳]

ڈاکٹر مصطفی مسلم نظم قرآن کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہم نے قرآن کریم کی نظم و مناسبت میں غور کیا۔ ہم نے پایا کہ قرآن کریم مختلف اشیاء کو خوبصورت نظم و تالیف اور مکمل پختگی سے بیان کرتا ہے۔ جس میں نہ کہیں اختلاف ہوتا ہے نہ ہی کلام کی روانی متاثر ہوتی ہے اور نہ ہی کلام کا جوبن ٹوٹتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی یا بڑی آیات میں بھی کلام کی بلاغت یکساں رہتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قصہ کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کے کلام میں بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم جب ایک ہی قصہ کو بار بار بیان کرتا ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس میں انتہا درجے کی فصاحت و بلاغت اور بہترین نظم و مناسبت پائی جاتی ہے۔"[۴]

---

(۱) فہد بن عبد الرحمن، خصائص القرآن الکریم، ریاسۃ ادارات البحوث العلمیۃ، ریاض، طبع سوم: ۱۴۰۹ھ، ص: ۲۱

(۲) سورۃ البقرہ: ۲۸۵

(۳) فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، ۸/ ۱۳۷

(۴) مصطفی مسلم، مباحث فی اعجاز القرآن، دار القلم، دمشق، طبع چہارم: ۲۰۰۳ء، ص: ۸۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا یرِیدُ اللّٰہُ لِیذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیتِ وَیطَھِّرَکُمْ تَطْھِیرًا﴾[۱]

اے اہل بیت اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور کرے اور تمہیں ایسا پاک کر دے جیسا پاک کرنے کا حق ہے۔

کی تفسیر میں ازواج مطہرات کو اہل بیت سے خارج کرنا اس لئے درست نہیں کہ اس آیت کریمہ کا سیاق وسباق نازل ہی ازواج مطہرات کے متعلق ہوا ہے۔ اگر نظم ومناسبتِ قرآن کریم کی رعایت کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر کی جائے گی تو بے تحاشا اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ قَالَ یوْسُفُ لِاَبِیهِ یاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیتُھُمْ لِیْ سٰجِدِینَ﴾[۲]

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! میں نے گیارہ ستاروں، ایک سورج اور ایک چاند کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں مرزا علی محمد باب (۱۸۲۱ء-۱۸۵۰ء) نے لکھا ہے:

"اس آیت میں یوسف سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔ ایک روز حضرت حسین نے اپنے والد سے کہا کہ میں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے، چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس آیت میں سورج سے مراد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا چاند سے مراد نبی کریم ﷺ اور ستاروں سے مراد ائمہ اہل بیت ہیں۔"[۳]

اگر قرآن کریم کی نظم ومناسبت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اس تفسیر کا بطلان بالکل واضح ہے کیونکہ جب یہاں قصہ ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے تو درمیان میں ائمہ اہل بیت کا تذکرہ کیسے آ گیا؟

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں نظم ومناسبت کا اثبات صرف کوئی لفظی بحث نہیں بلکہ قرآن مجید کے اعجاز کو ثابت کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور نظم ومناسبت سے قرآن کریم کے اسرار ورموز ایک انسان پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔

علم نظم قرآن کے فوائد وثمرات

---

(۱) سورۃ الاحزاب:۳۳

(۲) سورۃ یوسف:۴

(۳) ذہبی، علامہ محمد حسین، التفسیر والمفسرون، دار الحدیث، قاہرہ، ۲/ ۲۲۲

علم نظم کے بہت سے فوائد و ثمرات ہیں جن میں سے چند ایک کا اختصار سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔

اعجاز القرآن

قرآن کریم کی وجوہ اعجاز میں ایک اہم وجہ قرآن کریم کا علم نظم و مناسبت ہے۔ قرآن مجید میں نظم و مناسبت کا اثبات صرف کوئی لفظی بحث نہیں بلکہ قرآن مجید کے اعجاز کو ثابت کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ قرآن کریم میں جو نظم و تالیف پائی جاتی ہے اس کی تقلید کسی بھی طرح ممکن نہیں، قرآن کریم جیسا نظم وارتباط بشری استعداد سے ماورا ہے اور یہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ ﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا﴾[۱] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت کے سبب نزول کے متعلق منقول ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق اتری ہے جو از راہ عناد کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن میرے نزدیک اس طرح کی باتیں کہنا قرآن مجید پر ظلم عظیم ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید کی آیات میں باہم کوئی ربط و تعلق نہیں ہے حالانکہ یہ کہنا قرآن مجید پر بہت بڑا اعتراض ہے ایسی صورت میں قرآن کو معجزہ ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورۃ شروع سے آخر تک ایک مربوط کلام ہے۔"[۲]

قرآن کریم کی وجوہ اعجاز میں سے ایک اہم وجہ علم نظم کا ہونا ہے۔ اس تناظر میں شیخ عبد القاہر الجرجانی[۳] ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"جب عربوں کو یہ چیلنج کیا گیا کہ وہ کلام کریم کی مثل بنالائیں تو اس وقت وہ قرآن مجید کی ان مخصوص خوبیوں کو ضرور جانتے ہوں گے جو وہ اپنی عبارات میں پیدا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ بات بالکل عبث ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی کام کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح یہ کام نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید کی یہ خاص خوبی صرف اس کے الفاظ، حروف، اعراب اور اس کے مسجع جملوں میں ہی مخصوص نہیں ہو سکتی

(۱) سورہ حم السجدہ: ۴۱/ ۴۴

(۲) التفسیر الکبیر: ۲/ ۱۳۳

(۳) عبد القاہر بن عبد الرحمن محمد ابو بکر الجرجانی: لغت عرب کے امام تھے۔ اعجاز القرآن پر سند تصور کئے جاتے تھے۔ ان کی مشہور کتابوں میں دلائل الاعجاز اور الرسالۃ الشافعیۃ شامل ہیں۔ ۴۷۱ھ میں فوت ہوئے۔ (السیوطی، جلال الدین، بغیۃ الوعاۃ: ۲/ ۱۰۶، المکتبۃ العصریۃ، بیروت

کیونکہ عربوں کے نزدیک اس چیز کی مثل لانا کوئی مشکل نہ تھا۔ اس لئے قرآن مجید کی وہ خاص خوبی اس کی ترتیب اور الفاظ کی نظم و مناسبت میں ہی ہے جو ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو نزول قرآن سے پہلے معلوم نہ تھے۔"(۱)

اسرارِ کلام سے آگاہی

علم نظم و مناسبت ہی قرآن کریم کے مقصود اور اس کے متعلقات کی طرف رہنمائی کرتی ہے قرآن مجید کو نظم و مناسبت کی روشنی میں نہ پڑھا جائے تو قرآن مجید کا مقصود نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جو بھی نظم و مناسبت سے ناواقف ہو وہ آیات کے مطالب و مفاہیم تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وہ چیز ہے جو احکام کو ان کی کامل ترین صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر ہم نظم آیات سے آگاہ نہ ہوں تو ہم بہت سے معاملات کا ادارک نہیں کر سکتے اور ان کی قدر واہمیت سے ناواقف رہتے ہیں۔ علم نظم، قرآن حکیم کے خزانوں اور اس کی حکمتوں کی کلید ہے جس طرح یہ قرآن کریم کے اَسرار ورموز میں سے ایک راز ہے اسی طرح اس چیز نے قرآن مجید کو ایک ایسا سمندر بنا دیا ہے جس کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور اسے ایک ایسا خزانہ بنا دیا جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

علامہ مہائمی(۲) لکھتے ہیں:

"یہ خیرات وبرکات اور نظم قرآن کے نکتے، جنہیں مجھ سے پہلے جن وانس میں سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور میری کیا مجال تھی کہ میں انہیں چھوتا کیونکہ قرآن مجید کو صرف پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔ رب قدیر نے محض اپنے فضل سے مجھ پر بہت بڑا کرم فرمایا کہ میں اعجاز القرآن کی متعدد صورتوں کو اس کی نظم و مناسبت اور ترتیب آیات کے حسن وجمال کو آشکارا کروں جبکہ اس سے پہلے ان پر اخفا کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے مجھ پر واضح ہوا کہ قرآن مجید کے کلمات جامع ہیں اس کی آیات روشن ہیں اور کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں ہے"(۳)

اس سے واضح ہوا کہ نظم و مناسبت سے قرآن کریم کے اسرار ورموز ایک انسان پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے کی دلیل قرآن مجید کی نظم و مناسبت سے ہی ملی تھی

---

(۱) الجرجانی، عبد القاہر، دلائل الإعجاز، ص:۷۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الأولی، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸

(۲) علامہ علی بن احمد بن ابراہیم بن اسماعیل: ۷۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے جید علماء میں سے ہیں۔ مفسر بھی تھے اور عظیم صوفی بھی، بمبئی کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ۸۳۵ھ میں فوت ہوئے اور وہی دفن ہوئے۔ (علامہ مہائمی، مقدمہ تفسیر تبصیر الرحمن، مکتبۃ فاروقیہ، پشاور- شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار فی سر الابرار، ص: ۴۷، مطبع مجتبائی، دہلی۔

(۳) تفسیر تبصیر الرحمن: ۱/۱

کہ جب منکرین صلوٰۃ کے خلاف جہاد ضروری ہے تو منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیوں نہیں کیا جائے گا جبکہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر عموماً اکٹھا کیا جاتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر فرمایا تھا:

"واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوۃ والزکاۃ فان الزکاۃ حق المال و اللہ لو منعونی عقالاً کانوا یودونھا الی رسول اللہ لقاتلتھم علی منعھا"(۱)

بخدا! میں ہر اس شخص سے قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے خدا کی قسم! اگر وہ مجھے اونٹ کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں جسے وہ حضور ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ان سے قتال کروں گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی جن کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ قرآن کریم کی خدمت اور نظم و مناسبت کے اثبات میں گزرا اور جنہوں نے اپنے مطالعہ اور جدوجہد کا ماحاصل اپنی تفسیر "تدبر قرآن" کی شکل میں پیش کیا۔ وہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دق کا پتہ دینے والی بیماری کو نزلے کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش قرار دے دے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظم کلام سے واضح ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک سورۃ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورۃ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا"(۲)۔

وحدتِ امت

اختلاف نے امت کے وجود کو جو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ اس اختلاف کی بنیادی وجہ اور سبب قرآن کریم کی نظم و مناسبت سے اعراض کرنا ہے۔

کیونکہ ہر فرقہ وہ اپنے عقائد کو قرآن مجید سے ثابت کرتا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کیلئے آیات کریمہ کو ان کے سیاق و سباق سے بالائے طاق رکھ کر اور قرآن کریم کی نظم و مناسبت سے اعراض کر کے اپنی مرضی خود ساختہ معانی اخذ کر لیتا ہے۔ اگر قرآنی آیات کا مفہوم مناسبت وارتباط کے تناظر میں طے کیا جاتا تو وہ ایسا ہر گز نہیں کر سکتا

---

(۱) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ، رقم الحدیث: ۱۳۱۲، دار ابن کثیر الیمامۃ، بیروت، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۷ء

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ۱/ ۲۱، فاران فائونڈیشن، لاہور، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء

تھا۔ اور امت وحدت ویگانگت کی لڑی میں پروئی رہتی۔ چنانچہ جب قرآن کریم کی تفسیر میں نظم وارتباط کا التزام ترک کر دیا گیا تو ایک آیت کی بہت سی عجیب وغریب تاویلات کرنا بھی ممکن ہو گیا اور پھر جس نے جو چاہا کہتا چلا گیا اور امت میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور کس طرح امت کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾(۱)

تمہارے دوست صرف اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں وہی جو نماز قائم کرتے، زکوۃ دیتے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں لفظ "ولی" سے استنباط کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کرتے ہوئے شیخ طبرسی (م-۴۶۰ھ) لکھتے ہیں:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت اور امامت کے مستحق ہیں کیونکہ اس آیت میں فرمایا گیا کہ تمہارا ولی اللہ، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان ہیں اور اس آیت میں اہل ایمان سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ یہاں مومنین کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔ اس آیت کے مصداق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ آپ نے ہی حالت رکوع میں زکوۃ دی تھی۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ولی ہوئے اور ولی کا معنی اَوْلیاور اَحَقّ ہے۔ سو حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں پر متصرف اور ان کے حاکم ہوئے اور یہی خلافت اور امامت کا معنی ہے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ولی یعنی ان کے امام اور خلیفہ ہیں۔"(۲)

اگر مناسبت وارتباط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو شیخ طبرسی کا استدلال بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہاں زیر بحث مسئلہ خلافت نہیں تھا بلکہ دوستی اور محبت کس سے رکھنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ یہ آیت کریمہ جس سلسلہ کلام میں آئی ہے اس کی ابتدا اس آیت کریمہ سے ہو رہی ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّه مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۳)

---

(۱) سورہ المائدہ:۵/۵۵

(۲) شیخ طبرسی، التبیان فی تفسیر القرآن، ۳/۵۵۸، داراحیاء التراث العربی، بیروت

(۳) سورہ المائدہ:۵/۵۱

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انہیں میں سے ہو گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن مجید کی یہ مناسبت واضح کر رہی ہے کہ یہاں ولی سے مراد محبوب اور دوست ہے۔ اگر نظم و مناسبتِ قرآن کریم کی رعایت کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر کی جائے گی تو امت کے بہت سے اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

اس پس منظر میں امام حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

"مجھے اندیشہ ہے کہ ممکن ہے کہ عداوت اور بغض جس کی وبا آج مسلمانوں میں پھوٹ پڑی ہے اس بات کا نتیجہ ہو کہ ہم نے نظم قرآن کو نظر انداز کر کے خود قرآن کے ایک حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کے معانی کے بارہ میں ہماری رائیں مختلف ہو جائیں گی تو لازماً ہماری خواہش اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائیں گے اور ہمارا حال وہی ہو جائے گا جو اہل کتاب کا ہوا۔ صرف فرق یہ ہو گا کہ ان کے لئے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی تھا اور ہمارے لئے آخری چارہ کار صرف یہی قرآن ہے"[1]۔

تاویلِ صحیح کی طرف رہنمائی

جب کسی بھی آیت مبارکہ کی تأویل میں اختلاف پایا جائے تو نظم و مناسبت کا التزام ہی اس وقت احسن تاویل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آج ہر شخص اپنے خیال اور مسلک کے مطابق قرآن کی تأویل کر رہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے اس کو گھسیٹتے پھرتا ہے۔ علم نظم ہی وہ واحد چیز ہے جو صحیح سمت کو متعین کر سکتی ہے۔ جس سے اہل بدعت کی تحریفات سے بچا جا سکتا ہے۔ گویا نظم و مناسبت کے التزام سے صحیح تأویل کا تعین ہو ممکن ہے اور اس طرح ہر موقع پر نظم و مناسبت کا التزام احسن تاویل کیلئے مشعل راہ ہوتا ہے۔

امام حمید الدین فراہی بیان کرتے ہیں:

"تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورۃ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾[2] (ایک بار آور

---

(۱) حمید الدین فراہی، مجموعہ تفاسیر فراہی، ص: ۳۰، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء

(۲) سورہ ابراہیم: ۱۴/ ۲۴

درخت کے مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں)۔ اور سارے مسلمان اللہ کی رسی کو متحد ہو کر تھام لیتے۔"(۱)

عنایت اللہ سبحانی رقمطراز ہیں:

" النظام هو الدليل الى صحيح التاويل اذا اشتبهت الوجوه وكثرت الاحتمالات"(۲)

جب بہت سی وجوہات کا امکان اور بہت زیادہ احتمالات پائے جاتے ہوں تو اس وقت نظم و مناسبت ہی صحیح تاویل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَه بِيَمِيْنِه فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾(۳)

ہم ہر شخص کو اس دن اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ پس جسے اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا تو وہ اپنے نامہ اعمال کو پڑھیں گے اور ان پر بال برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تأویل میں درج ذیل اقوال نقل کیے ہیں:

"یہاں امام سے مراد ان کا نبی ہے۔۔۔ دوسرا قول ضحاک اور ابن زید کا ہے کہ یہاں امام سے مراد ان کی کتاب ہے یعنی قرآن والوں کو اے اہل قرآن! اور تورات والوں کو اے اہل تورات! کہہ کر پکارا جائے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہاں امام سے مراد ان کے نامہ اعمال ہیں۔ یہ حسن، ربیع اور ابو العالیہ کا قول ہے اور چوتھا قول یہ ہے کہ امام سے مراد ان کی مائیں ہیں اس قول کو امام رازی نے خود ہی رد کر دیا ہے اور پانچواں قول ان کے اخلاق فاضلہ یا فاسدہ ہیں۔"(۴)

اگر نظم و مناسبت کا التزام کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ آیت مبارکہ میں امام سے مراد ان کا نامہ اعمال ہے کیونکہ انہیں امام کے ساتھ بلانے کے بعد فرمایا:

﴿فمن اوتی کتابه بیمینه﴾

پس جسے اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔

لفظ ف سے واضح ہوتا ہے کہ امام سے مراد کتاب ہی ہے اور حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے رسول

---

(۱) مجموعہ تفاسیر فراہی، ص:۲۹

(۲) البرھان فی علوم القرآن، ص:۲۳

(۳) سورہ بنی اسرائیل:۱۷/۷۱

(۴) التفسیر الکبیر، ص:۲۱/۱۷

اللہ ﷺ نے ﴿یوم ندعو کل اناس بإمامھم﴾ کی تفسیر میں ارشاد فرمایاہے:

"یدعی احدھم فیعطی کتابہ بیمینہ"(۱)

ان میں سے ہر ایک کو بلایا جائے گا اور اس کا نامہ اعمال
اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ مناسبت وارتباط کا التزام ہی وہ واحد ہے جو احسن تأویل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

استنباط مسائل کا ذریعہ

نظم ومناسبت کے التزام کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے قرآن کریم سے مسائل مستنبط کرنے میں رہنمائی ملتی ہے۔ یہی چیز مسائل کے استنباط میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ﴾(۲)

پس اپنے رب کیلئے نماز پڑھ اور قربانی کر۔

لغت عرب میں نحر کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بارے میں امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

"نحر کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً نماز کے افعال جیسے استقبال قبلہ، دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا، سینہ تک ہاتھ اٹھانا، نفسانی خواہشات کا قلع قمع کرنا اور جانور کو ذبح کرنا نَحَرَ الْبَھِیمَۃَ کا معنی ہے اس نے جانور کو ذبح کیا۔"(۳)

نَحَرَ کا لفظ اگرچہ متعدد معانی میں مستعمل ہے لیکن نظم ومناسبت کا التزام جس أحسن تاویل کو متعین کرتا ہے وہ جانور کو ذبح کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز کے بعد زکوۃ کا حکم دیا اور یہاں بھی نماز کے بعد نحر کا حکم ہے اور قربانی بمنزلہ زکوۃ کے ہے اور مشرکین مکہ نمازیں بھی بتوں کے لئے پڑھتے تھے اور قربانی بھی بتوں کیلئے کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی ترتیب سے دونوں کام اپنی ذات کیلئے مخصوص کر لئے ہیں۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا ۚ لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْہِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَۃً وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾(۴)

---

(۱) ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی، جامع ترمذی، ص:۲/ ۱۴۶، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ بنی اسرائیل، سعید کمپنی، کراچی

(۲) سورہ الکوثر:۱۰۸/ ۲

(۳) التفسیر الکبیر، ص:۳۳/ ۱۳۲

(۴) سورہ النحل:۱۶/ ۵-۸

اور اس نے چوپائے پیدا کئے جن سے تمہیں گرم لباس ملتا ہے اور کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو اور ان میں تمہارے لئے خوبصورتی ہے جب تم شام کو انہیں لاتے ہو اور صبح کے وقت چھوڑتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ ان مقامات تک پہنچاتے ہیں جہاں تک تم سخت محنت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا شفیق مہربان ہے۔ اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کیلئے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کا ذکر کیا کہ تم ان سے گرم لباس بناتے اور انہیں کھاتے بھی ہو اور پھر گھوڑے، گدھے اور خچر کا ذکر کیا اور ان کے متعلق بتایا کہ وہ تمہارے لئے زینت ہیں اور تمہاری سواری کے کام آتے ہیں۔ ان جانوروں کا ذکر چوپاؤں کے ساتھ نہ کرنا اس چیز کی دلیل ہے کہ یہ جانور کھانے کیلئے نہیں بلکہ سواری اور زینت کیلئے ہیں۔ اگر یہ بھی کھانے کیلئے ہوتے تو ان کا ذکر بھی انہیں کے ساتھ کر دیا جاتا اور ان کی تخلیق کی علت کو الگ ذکر نہ کیا جاتا۔

ملا احمد جیون انبیٹھوی[۱] لکھتے ہیں:

"اس آیت سے مقصود جیسا کہ امام ابو حنیفہ نے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ گھوڑا، گدھا اور خچر حرام ہے اس کی وجہ جیسا کہ کشاف، مدارک اور ہدایہ باب الذبائح میں ذکر کی گئی ہے یہ ہے کہ یہ احسان کے تذکرہ میں نازل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا تذکرہ زینت اور سواری کیلئے فرما کر ان کا احسان یاد دلایا۔ ثابت ہوا کہ ان اشیاء میں نعمت کا کمال یہی چیزیں ہیں کیونکہ حکیم کبھی بھی اعلی نعمت کے ہوتے ہوئے ادنیٰ نعمت کا احسان نہیں جتلاتا پس ثابت ہوا کہ گھوڑا، گدھا اور خچر کا کھانا جائز نہیں"[۲]۔

استنباط مسائل اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے نظم و مناسبت قرآن کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔

❁❁❁

(۱) احمد جیون بن ابی سعید بن عبداللہ: ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی مشہور کتابوں میں نور الأنوار اور التفسیرات الاحمدیہ شامل ہیں۔ ۱۱۳۰ھ دہلی میں فوت ہوئے اور وہی دفن ہوئے۔ عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین، ص:۱/ ۲۳۳، داراحیاء، التراث العربی، بیروت

(۲) ملا احمد جیون انبیٹھوی، التفسیرات الاحمدیہ، ص:۴۹۳، مکتبۃ الحرم، اردو بازار، لاہور

سرسید احمد خان کے تصور معجزات پر مولانا ثناءاللہ امر تسری رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید کا خصوصی مطالعہ

عابدہ نسرین*
ڈاکٹر محمد ادریس لودھی**

ABSTRACT

Sir Sayed Ahmad Khan (1817-1898) was an Indian Muslim pragmatist, reformist and philosopher of nineteennth century British India. Sir Sayed Ahmad Khan says that in the histroy of the Prophets in the incidents which were regarded as miracles were not miracles but happening which took place according to the natural laws. According to him nothing happens which is against the law of nature.He rejects miracles not because they are contrary to reason but because Holy Quran does not lend to support to miracles. This paper attempts to enlighten Sir Syed, concept of miracles and explores the criticism of Moulana Sana Ullah Amratsari (1868-1948) on his concept of miracles.

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
** چیئرمین، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

برصغیر کی علمی شخصیات میں ایک نامور شخصیت مولانا ثناء اللہ امر تسری کی ہے۔ مولانا کا خاندان سرزمین کشمیر سے تھا۔ آپ کے والد ماجد نے کشمیر کو چھوڑا اور کاروبار کرنے کے لیے امر تسر تشریف لے آئے اور یہیں رہائش پذیر ہوگئے۔ مولانا ثناء اللہ جون ۱۸۶۸ء بمطابق ۱۲۸۸ھ میں امر تسر میں پیدا ہوئے۔[۱] ابتداء میں آپ نے مولانا احمد اللہ[۲] کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ ۱۸۹۲ء میں مولانا نے مدرسہ فیض عام سے فارغ التحصیل ہوئے۔[۳] ۱۸۹۹ء میں مولانا عبد المنان وزیر آبادی[۴] سے حدیث میں سند حاصل کی۔[۵] اس کے بعد شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ[۶] کی شاگردی اختیار کرلی اور مولانا عبد المنان وزیر آبادی کی سند دکھا کر ان سے

---

(۱) امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر قرآن مع تفسیر ثنائی، ثنائی اکیڈمی، لاہور، ص:۸۳۴

(۲) مولانا احمد اللہ امر تسری (المتوفیٰ:۱۹۱۶ء) امر تسر کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ عالم باعمل تھے۔ ابو عبیدہ کنیت تھی۔ مولانا غلام علی قصوری کے شاگرد تھے اور مسجد غزنویہ میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ امر تسر کی مبارک مسجد آپ نے بنوائی تھی۔ امر تسر میں درس قرآن کا سلسلہ بھی آپ ہی نے شروع کیا تھا۔ "کلام المسعود فی مسئلۃ المولود" آپ کی تصنیفات میں سے ہے۔ (سوہدروی، عبد المجید خادم، سیرۃ ثنائی، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور، طبع اول: مئی ۱۹۸۹ء، ص:۱۰۸-۱۰۹)

(۳) امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر قرآن مع تفسیر ثنائی، ص:۸۳۵

(۴) مولانا حافظ عبد المنان وزیر آبادی (۱۲۶۷ھ-۱۳۳۴ھ) ایک جیّد عالم دین، فقیہ اور محدث تھے۔ انہیں محدث پنجاب بھی کہا جاتا ہے۔ ضلع جہلم کے ایک گاؤں کروم میں پیدا ہوئے۔ ۸ سال کی عمر میں آشوب چشم کی وجہ سے آپ کی بینائی چلی گئی۔ شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی کے یہاں جملہ علوم و فنون بالخصوص حدیث اور تفسیر کی تکمیل کی۔ قیام دہلی کے دوران میں بانی دار العلوم دیوبند محمد قاسم نانوتوی و دیگر نامی گرامی علما سے بھی ملاقاتیں کیں۔ تکمیل دورۂ حدیث کے بعد امر تسر مولانا عبد اللہ غزنوی کے پاس آگئے۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وزیر آباد آگئے۔ جہاں تاحیات رہے۔ نامور شاگردوں میں ثناء اللہ امر تسری، مولانا میر سیالکوٹی، ابو القاسم سیف بنارسی، مولانا اسمعیل گوجرانوالی ہیں۔ آپ کو بخاری شریف ساٹھ مرتبہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کا چہرہ بارعب، آواز بلند، قد دراز، طبیعت قلندری اور عادات سکندری تھیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ مسائل میں متشدد اور تنگ دل نہیں تھے۔ رمضان ۱۳۳۴ ہجری کو وزیر آباد میں انتقال ہوا۔ (شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ۱۰۶۱/۲۵، ۱۰۶۰)

(۵) امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر ثنائی، ادارہ ترجمان السنہ، لاہور، ص:۵

(۶) شیخ الکل السیّد الامام نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش:۱۸۰۵ء ــــ وفات:۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء) تیرہویں وچودھویں صدی ہجری کے جید عالم، محدث وفقیہ، مفسر و مجتہد، مدرس و مبلغ اور ایک صاحبِ نظر بزرگ تھے۔ وہ ۱۲۲۰ھ کو بہار کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں سورج گڑھ میں پیدا ہوئے۔ عظیم آباد میں انہوں نے سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی زیارت کی اور ان کے وعظ و نصائح سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں انہوں نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے ۱۳ برس استفادہ کیا اور علوم القرآن والحدیث کی تحصیل کی۔ تکمیل کے بعد اپنے استاد کی مسند فضیلت پر متمکن ہوئے اور پوری زندگی اپنے آبائی وطن اور افرادِ خاندان سے دور دہلی میں اپنے استاد گرامی کی

حدیث میں سند واجازت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ پھر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور [۱] تشریف لے گئے۔ لیکن سہارنپور تھوڑا عرصہ رہے۔ پھر علم کی کشش انھیں دارالعلوم دیوبند [۲] لے آئی۔ یہاں سے علم حاصل کرنے کے بعد کانپور [۳] روانہ ہوئے اور مولانا احمد حسن [۴] سے بھی کسب فیض کیا۔ ان مختلف اساتذہ کے اسلوب نے اور علم و فن کے تمام بڑے چشموں سے سیر اب ہونے کے سبب مولانا کے اندر ایک گونہ اعتدال اور توازن پیدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں ان کی شخصیت اور تحریر میں ان سب کی خوبیاں جمع ہو گئیں۔ مولانا خود لکھتے ہیں:

مسند تدریس پر فائز ہو کر خدمت انجام دیتے رہے اور بڑی شان واستغنا کے ساتھ متوکلانہ زندگی بسر کی۔ متاخرین میں تلامذہ کا اتنا بڑا حلقہ ان کے سوا کسی کا مقدر نہیں بنا۔ ان کی ۶۰ سالہ خدمت تدریس کے نتیجہ میں بڑے بڑے اعاظم رجال پیدا ہوئے۔ ۱۳۲۰ھ میں دہلی ہی میں وفات پائی۔ (حسینی، محمد تنزیل الصدیقی، افاداتِ نذیریہ، مشمولہ مجلہ الواقعہ، کراچی، شمارہ ۴۸-۴۹، جمادی الثانی ورجب المرجب ۱۴۳۷ھ)

(۱) جامعہ مظاہر علوم سہارنپور انڈیا کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں رجب ۱۲۸۲ھ نومبر ۱۸۶۶ کو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے محض چند ماہ بعد قائم ہوا۔ مدرسہ کی ابتدا مکتب کی صورت میں محلہ چوک بازداران کی مسجد سے ہوئی۔ اور بہت جلد ہی عالم اسلام میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کا شمار اپنی دینی، علمی، تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی خدمات کی بنا پر دیوبندی مکتب فکر کے کلیدی اداروں میں ہونے لگا۔ (ماخوذ: http://mazahiruloom.org/SubMenu3.aspx، اخذ کردہ: ۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بروز اتوار، بوقت: ۸:۰۰ بجے شب)

(۲) ضلع سہارنپور کے ایک قصبے نانوتہ کے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء بمطابق ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد (مسجد چھتہ) میں مدرسۃ دیوبند کی بنیاد رکھی۔ واضح رہے کہ اس نیک کام میں انہیں مولانا سید محمد عابد دیوبندی صاحب، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی صاحب اور مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی صاحب کا عملی تعاون حاصل رہا۔ (ماخوذ: http://www.darululoom-deoband.com/urdu/، اخذ کردہ: ۵ جنوری ۲۰۲۰ بروز اتوار، بوقت: ۸:۰۰ بجے شب)

(۳) کانپور بھارت کی ریاست اتر پردیش کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اس کے علاوہ اتر پردیش کا اہم تجارتی مرکز ہے۔

(۴) علامہ احمد حسن حنفی بطالوی (پٹیالہ) کانپوری شہر بطالہ (پٹیالہ) میں پیدا ہوئے جو 'گورداس بود' کے مضافات میں سے ہے اور وہیں بڑے بھی ہوئے۔ حصول علم کے لیے علی گڑھ شہر میں مفتی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں رہنے لگے اور وہیں سے فراغت پائی۔ پھر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں بحیثیت استاد مقرر کیے گئے، چنانچہ کافی زمانہ تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، پھر کانپور شہر کے مدرسہ فیض عام میں ذمہ دار بنائے گئے، نتیجہ کے طور پر وہیں شادی کر کے رہائش اختیار کر لی اور طویل مدت تک درس دیتے رہے۔ پھر وہاں سے سفر کر کے حجاز مقدس تشریف لے گئے اور حج و زیارت مقامات مقدسہ سے فارغ ہوئے۔ پھر شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت طریقت حاصل کی اور ہندوستان لوٹ آئے۔ ۱۳۲۲ھ میں کان پور شہر میں آپ کی وفات ہوئی۔ (حسنی، عبد الحی بن فخر الدین بن عبد العلی الطالبی، الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام المسمی بنزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، لطبع اول: ۱۹۹۹م، ۸/ ۱۱۸۰)

"میں نے حدیث کا علم جن شیوخ سے حاصل کیا ان میں سے حافظ عبد المنان پنجاب سے، مولانا محمود حسن[۱] دیوبند سے اور کانپور میں مولانا احمد حسن تھے۔ میں نے حدیث کے تینوں استادوں سے جو طرز تعلیم سیکھا وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے"۔[۲]

فارغ التحصیل ہو کر آپ واپس امر تسر تشریف لے آئے اور مدرسہ تائید الاسلام میں تدریس کرنے لگے۔ علاوہ ازیں آپ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے صوبہ پنجاب کے امیر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا ہجرت کر کے امر تسر سے لاہور تشریف لائے۔ بعد ازاں لاہور، گوجرانوالہ اور پھر سرگودھا تشریف لے گئے۔ اور وہیں آپ ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

اسی دور میں عیسائی پادری مسلمانانِ برصغیر کو ان کے مذہب سے متزلزل کر رہے تھے اور مناظرے کر رہے تھے۔ آپ کی حساس طبیعت پر اس کا اثر ہوا اور اسی جذبہ کے تحت انہوں نے دوران تعلیم ہی مناظروں میں شرکت شروع کر دی۔ بعض اوقات آپ امر تسر کے گرجاگھر میں چلے جاتے، پادریوں کی گفتگو سن کر اور ان کے سامنے ایسے اعتراضات پیش کرتے کہ بے چارے لاجواب ہو جاتے۔[۳]

آپ نے تقریباً ۴۷ کتب و رسائل تحریر فرمائے[۴] اور زیادہ تر اسلام کی مدافعت اور فرق ہائے باطلہ کی تردید میں لکھا۔ اسی طرح آخری دم تک صحافتی سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آپ مخالفین کی تردید کرتے ہوئے الزامات عائد کرنے سے اجتناب کرتے اور ان کے مستند مصادر اور امہات کتب ہی سے اقتباسات پیش کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی متعدد مصروفیات کے باوجود قرآن کریم کی چار تفاسیر بھی لکھیں۔ ان میں سے دو عربی زبان میں بنام "تفسیر القرآن بکلام الرحمن"[۵] اور "بیان الفرقان علی علم البیان" لکھیں۔ اسی طرح اردو زبان میں "تفسیر بالرائے" اور "تفسیر ثنائی" لکھیں۔

---

(۱) مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۸۵۱–۱۹۲۰ء) دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد، مشہور عالم دین، درالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور برصغیر کی آزادی کے لیے انگریز کے ہاتھوں مالٹا کی اسیری برداشت کی۔ شیخ الہند اور اسیر مالٹا آپ کے القابات ہیں۔

(۲) امر تسری، ثناءاللہ، تفسیر ثنائی، ادارہ ترجمان السنہ، لاہور، ص:۵

(۳) سوہدروی، عبدالمجید خادم، سیرت ثنائی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ص:۱۱۰

(۴) آپ کی چند مشہور کتب درج ذیل ہیں: آیات متشابہات، تعلیم القرآن، الفوز العظیم، حق پرکاش، ترک اسلام، الہام، الہامی کتاب، مناظرہ دیوریا، مباحثہ ناہن، تقابل ثلاثہ، بطش قدیر بر قادیانی تفسیر کبیر، معارف قرآن بجواب حقائق قرآن، دلیل الفرقان، الکلام المبین فی جواب الاربعین وغیرہ۔

(۵) اس تفسیر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں امر تسر سے شائع ہوا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: قرآن پاک کی تفسیریں، چودہ برس میں، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۹ء، ص:۳۰۴

مولانا ثناء اللہ امر تسری کا تصور معجزات

کوئی کام اپنے عمومی اسبابِ کی عدم موجودگی میں کسی ایسے شخص سے سرزد ہو جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو تو اسے معجزہ یا خارقِ عادت کہتے ہیں۔[۱] اگر یہ کام نبی کی اتباع کرنے والا یا ولی کرے تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔[۲] اگر کسی ولی کے علاوہ کسی نیک آدمی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اسے "معونت" کہا جاتا ہے۔[۳] اگر کوئی ایسا کام کسی نبی کی بعثت سے پہلے ظاہر ہو تو اسے "ارہاص" کہتے ہیں۔[۴] اگر کسی غیر مسلم سے ظاہر ہو تو اسے "استدراج" کہتے ہیں۔[۵]

معجزہ کے خرق عادت ہونے کے حوالہ سے مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ علماء کے نزدیک معجزہ کا خرق عادت ہونے کا جو مفہوم ہے، وہ اور ہے اور ہم جو انکار کرتے ہیں، اس سے ہم کچھ اور مراد لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک معجزہ موافق عادت ہے اس لیے ہم اس کو نبوت کے ساتھ لازمہ مجہول الکیفیت مانتے ہیں۔[۶]

بعض لوگ، جن میں سر سید[۷] بھی شامل ہیں، معجزہ اور مسمریزم[۸] کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ تاہم مولانا امر تسری نے ان میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے مطابق معجزہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے

---

(۱) جرجانی، علی بن محمد بن علی الزین، کتاب التعریفات، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع اول: ۱۹۸۳م، ص: ۲۱۹

(۲) ایضا، ص: ۱۸۴

(۳) تھانوی، محمد بن علی ابن القاضی الحنفی، موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، مکتبۃ لبنان، بیروت، طبع اول: ۱۹۹۶م، ۱۶۰۱/۲

(۴) جرجانی، کتاب التعریفات، ص: ۱۶

(۵) ایضا، ص: ۲۰

(۶) امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر ثنائی، ۱/ ۳۸۲

(۷) سید احمد بن متقی خان (۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء–۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) المعروف سر سید انیسویں صدی کے مصلح اور فلسفی تھے۔ سر سید احمد خان ایک نبیل گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے مغل دربار کے ساتھ مضبوط تعلقات تھے۔ سر سید نے قرآن اور سائنس کی تعلیم دربار میں ہی حاصل کی، جس کے بعد یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے انہیں قانون میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ سر سید احمد خان ۸۱ سال کی عمر میں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے اور اپنے کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔

(۸) ڈاکٹر فریڈرک میزمر صاحب باشندہ میزربرگ واقع ملک آسٹریا کا ایجاد کیا ہوا علم، جسے خوابِ مقناطیسِ حیوانی یا تاثیر الانظار کہنا چاہیے۔ اس علم میں آدمی کے حواس ظاہری کو بمراد افزونی ادراک باطنی واظہار کمالِ نفس ناطقہ معطل کر کے دنیا کے خفیہ آئندہ موجودہ گزشتہ حالات کی معلومات بہ شرکتِ خیالاتِ عامل ومعمول بہم پہنچانے کی ترکیبیں بتائی گئی ہیں۔ یہ عمل ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے یا انگلیوں کے آنکھوں کے سامنے متواتر ہلانے سے کیا جاتا ہے۔ حکمائے اشراقین اس عمل کو صرف تصور کے ذریعہ سے کرتے تھے۔ (دہلوی، سید احمد، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، وفاقی وزارت تعلیم، حکومت پاکستان، طبع ششم (عکسی): ۲۰۱۰ء، ۴/ ۳۵۲–۳۵۳)

برعکس مسمریزم میں دیگر افعال اثر انداز ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی دوسرے کی تعلیم کا ہی اثر کیوں نہ ہو۔ دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔[۱]

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرسید معجزات اور کرامات کا انکار ان کے خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں، لیکن اگر معجزات کے حوالہ سے سرسید کے نظریہ کو بنظر غائر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ معجزات اور کرامات کا انکار اس لیے نہیں کرتے کہ وہ خلاف عقل ہیں، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ قرآن میں ان معجزات کا کوئی ثبوت نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اہل علم نے معجزات و کرامات کا انکار جس سبب سے بھی کیا ہو مگر ہم صرف اس لیے ان کا انکار نہیں کرتے کہ یہ خلاف عقل ہیں، بلکہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں معجزات و کرامات جو خرق عادت ہوتے ہیں، ان کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔"[۲]

مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ نے سرسید کے معجزات کے حوالہ سے تصورات پر تنقید کرتے ہوئے یہ سعی کی ہے کہ سرسید کے اپنے قواعد کی روشنی میں ان کے فکری اور داخلی تضادات کو وضاحت سے پیش کیا جائے۔ چنانچہ سرسید احمد خان کے مذکورہ بالا بیان کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے کہ گویا سرسید کو معجزات کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ انہیں بس اس بات کا ثبوت چاہیے کہ قرآن مجید میں معجزات کا ذکر ہے۔ لہٰذا ہم بھی اسی پر توجہ دیں گے کہ ان کے سامنے قرآن میں مذکور معجزات کی نشاندہی کر دیں۔[۳]

بنی اسرائیل کے لیے سمندر پھٹنے کا انکار

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾[۴]

اور جب تمہارے لیے ہم نے دریا کو پھاڑا اور تم کو بچایا اور تمہارے دشمن فرعونیوں کو دیکھتے ہی اسی میں غرق کر دیا۔

سب مفسرین نے اس واقعہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کہا ہے کہ ان کی قوم جس پانی سے بے سروسامانی کی حالت میں صحیح سلامت پار چلی گئی، قوم فرعون کو اللہ تعالیٰ نے اسی پانی میں ڈبو دیا۔[۱] تاہم سرسید کے نزدیک یہ واقعہ

---

(۱) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۳۹۴

(۲) سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، ۳/ ۳۷

(۳) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۳۸۴

(۴) سورۃ البقرہ: ۵۰

معجزہ نہیں ہے۔ ان کے بقول: ہمارے علماء نے اپنی پرانی عادت کے مطابق یہودیوں سے ایسی روایات لے کر قرآن کی تفسیر کر دیتے ہیں۔ جبکہ نہ کوئی دریا دو حصوں میں تقسیم ہوا اور نہ کوئی خرق عادت امر پیش آیا۔ بلکہ سمندر کی طرح اس دریا کی عادت ہی تھی کہ اس میں مد و جزر آناً فاناً ہوا کرتا تھا۔ اس لیے دراصل یوں ہوا کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر وہاں سے گزرنے لگے تو یہ دریا کے خشک ہونے کا وقت تھا اور جب فرعون نے تعاقب کرتے ہوئے اس خشک راستے پر چلنا چاہا تو اتفاقاً پانی چڑھ گیا۔ سر سید کے مطابق اس آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے دریا کے پھٹنے کو خرق عادت قرار دیا جا سکے۔ (۲)

مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ سر سید کی اس رائے سے متعلق لکھتے ہیں:

> "قرآن مجید سے بالکل واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنا احسان جتلا رہے ہیں کہ ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دلانے کے لیے دریا کو پھاڑ کر تمہیں پار کروا دیا اور تمہارے دشمن کو اس میں غرق کر دیا۔ پس اس سے یہ واضح کرنا مقصود نہیں تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے سو اس لیے یہ بھی ہو گیا ہے جس سے قوم بنی اسرائیل کی نجات علت غائی تھی۔ یہ بات بالکل بے معنی ہے اور یہ بنی اسرائیل پر کوئی احسان نہیں"۔ (۳)

سر سید احمد خان نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں لغت عرب سے استشہاد کیا اور قرآنی لفظ "ضرب" کا مطلب "مارنا" کی بجائے "چلنا" کیا۔ ان کے مطابق آیت میں ضرب کا لفظ "مارنا" کے معنیٰ میں نہیں بلکہ "چلنا" کے معنیٰ میں ہے اور البحر سے پہلے "فی" محذوف ہے۔ لہٰذا آیت کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے عصا کے سہارے سے سمندر میں چلو۔ (۴)

مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ نے سر سید کے مذکورہ بالا لغوی استشہاد کا جواب بھی لغت عرب سے پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس حوالے سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور واقعہ غرق فرعون کے حوالے سے علماء و مفسرین کے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو: قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۶ء، ۲/۹۶۔۹۷

(۲) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۱/۹۹۔ نیز ۱/۷۷

(۳) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/۵۵

(۴) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۱/۸۸

"حرف جارہ کا حذف لغتِ عرب میں جائز تو ہے لیکن ہر جگہ حرفِ جارہ کو محذوف کرنا لغتِ عرب کے بالکل خلاف ہے۔ وگرنہ عبارت کی تفہیم بہت مشکل ہو جائے گی۔"(۱)

سر سید نے اپنی تحقیق میں کتب سماوی سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ آیات قرآنی کی وضاحت میں تورات وانجیل سے استشہاد کو بہت اہم تصور کرتے ہیں۔ کتب سماوی چونکہ بطلیموس(۲) کی کتب سے قدیم ہیں، اس لیے مولانا ثناء اللہ امر تسری رحمۃ اللہ علیہ نے سر سید کی تفسیر میں پائے جانے والے داخلی تضاد واختلاف کو نمایاں کیا ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ کتب سماوی بطلیموس کے نقشوں سے پرانی ہیں اور خود سر سید ان کتب کو بہت زیادہ اہم قرار دیتے ہیں، اس لیے مناسب تھا کہ وہ ان کتب میں لکھی ہوئی بحر احمر(۳) کی کیفیت دیکھ لیتے۔ مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو تحقیق سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہ جب دل چاہا کتب سماوی سے استدلال کر لیا اور جب جی نہ چاہا تو انہیں نظر انداز کر دیا۔

پتھر سے پانی پھوٹنے کا انکار

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِه فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾(۴)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے حکم دیا کہ اپنے عصا کو لکڑی پر مار، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

مذکورہ آیت مبارکہ جس معجزے کو بیان کر رہی ہے، تورات بھی اس واقعہ کو انہی تفصیلات سمیت ذکر کرتی ہے۔(۵) مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ(۶) نے حضرت موسیٰ کے اس معجزے کے حوالے سے لکھا ہے کہ

---

(۱) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۵۵

(۲) بطلیموس (Ptolemy) (۱۰۰ – ۱۷۰ء) دوسری صدی عیسوی کا مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان۔ اسکندریہ مصر میں پیدا ہوا۔ اس نے نظام شمسی کا زمین مرکزی (Earth-centered) نظریہ پیش کیا۔ اس موضوع پر اُس کی کتاب "المجستی" بہت مشہور ہے۔

(۳) بحر احمر (Red Sea) یا بحیرہ قلزم بحر ہند کی ایک خلیج ہے۔ یہ آبنائے باب المندب اور خلیج عدن کے ذریعے بحر ہند سے منسلک ہے۔ اس کے شمال میں جزیرہ نمائے سینا، خلیج عقبہ اور خلیج سوئز واقع ہیں جو نہر سوئز سے ملی ہوئی ہے۔ ۱۹ویں صدی تک یورپی اسے خلیج عرب بھی کہتے تھے۔

(۴) سورۃ البقرہ:۶۰

(۵) کتاب سفر خروج، باب اول

(۶) حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ بڑے مفسر اور محدث تھے، ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں آپ کی پیدائش ہوئی، علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے کبار اہل علم سے آپ نے علم حاصل کیا، بعد میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ

موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ متعدد اعتبار سے معجزہ تھا۔ کہ پانی کا چھوٹے پتھر سے نکل کر ضرورت سے زائد مقدار میں بہنا اور ضرورت پوری ہونے کے بعد بند ہو جانا۔ ہر لحاظ سے یہ واقعہ قدرت الٰہیہ کا ایک خاص نشان اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ (۱)

تاہم سر سید کے نزدیک یہ واقعہ معجزہ نہیں ہے۔ ان کے مطابق حجر کا مطلب پہاڑ ہے اور ضرب کا مطلب رفتن ہے۔ گویا اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اپنے عصا کے ذریعے پہاڑ پر چلو۔ پہاڑ کی دوسری طرف ایسی جگہ ہے جہاں پانی کے بارہ چشمے جاری ہیں۔ جن کے متعلق اللہ نے فرمایا:

﴿فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا﴾ (۲)

اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ (۳)

سر سید کی اس رائے پر مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ضرب کے معنیٰ "رفتن" اس وقت آتے ہیں جب ضرب کے بعد "فی" حرف جارہ آئے۔ مذکورہ واقعہ کی تفصیلات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہیں بھی ضرب کے بعد "فی" حرف جارہ کا استعمال نہیں کیا، اس لیے یہاں ضرب کا معنیٰ "رفتن" لینا درست نہیں۔ اگر سر سید یہ کہیں کہ یہاں "فی" حرف جارہ محذوف ہے تو جس طرح کسی عبارت میں موجود حرفِ جارہ کو حذف ماننا درست نہیں، اسی طرح بلا ضرورت کسی عبارت میں حرفِ جارہ کو محذوف تسلیم کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح نص میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ (۴)

لاٹھی کے سانپ بننے کے معجزہ کا انکار

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَأَلْقٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۵)

پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینک دی۔ وہ صریح ایک اژدھا تھا۔

التفسیر کے عہدے پر باقاعدہ فائز کیے گئے، ۱۹۷۴ء / ۱۳۹۴ھ میں انتقال ہوا۔ معارف القرآن، مشکاۃ کی شرح "التعلیق الصبیح" اور عقائد الاسلام آپ کی عمدہ تصانیف ہیں۔

(۱) کاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن، مکتبۃ المعارف، شہداد پور، سندھ، ۱۹۲۲ء، ۱/۱۸۸

(۲) سورۃ البقرہ:۶۰

(۳) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۱/۱۱۲

(۴) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/۶۳

(۵) سورۃ الاعراف:۱۰۷

سر سید نے اس معجزہ کی تاویل کرتے ہوئے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت متخیلہ قرار دیا ہے۔ سر سید کے بقول یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جو ان پر اثر انداز ہوئی تھی۔ یہ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت نہ تھا۔ (۱)

سر سید کی مذکورہ بالا تاویل بظاہر ضعیف ہے۔ اسی لیے مولانا امر تسری نے اس پر سخت گرفت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "سر سید کی اسی بات سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر ایسی قوت مقناطیسی ہے جسے استعمال کر کے انسان دوسروں تک اثر پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ حضرت موسیٰ بھی اسی قوت سے متاثر ہوئے تھے، درست نہیں۔ کیونکہ مسمریزم کا عامل دوسروں پر اثر انداز تو ہو سکتا ہے، لیکن خود متاثر نہیں ہوتا۔" (۲)

عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کا انکار

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ (۳)

جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے کلمہ کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ، مریم کا بیٹا مرتبے والا دنیا میں اور آخرت میں اور نزدیک والوں میں۔

جمہور مفسرین کا یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے اور یہ واقعہ خلاف عادت ہونے کے سبب مسلمانوں ہی نہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی معجزہ مانا جاتا ہے۔ (۴) تاہم سر سید اس کو معجزہ خیال نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اس کو شادی مانتے ہیں جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ (۵)

مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ اس رائے پر نقد کرتے ہیں کہ سب مفسرین بن باپ پیدائش مانتے ہیں اور قرآن میں یہ بات تو بالکل واضح ہے، جیسا کہ سورۃ مریم میں مریم علیہا السلام کے تذکرہ میں ہے کہ جب فرشتے نے انہیں بیٹے کی خوشخبری دی تو انہوں نے کہا:

---

(۱) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۲/ ۱۱۱-۱۱۴

(۲) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۲۷۴-۲۷۵

(۳) سورۃ آل عمران: ۴۵

(۴) متی، باب ۱، درس ۱۸۔ لوقا، باب ۱، درس ۲۶

(۵) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۲/ ۲۷-۳۰

﴿أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا﴾ (۱)

میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (۲)

مریم بولی پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا؟ مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا، جواب ملا: ایسا ہی ہو گا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی فطری طریق کے مطابق تھی تو اس میں قدرتِ الٰہی کے تذکرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ سورۃ آل عمران میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (۳)

اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔

لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش کے منکرین غور نہیں کرتے یا انصاف نہیں کرتے۔ (۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گہوارے میں بات کرنا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (۵)

اور وہ باتیں کرے گا لوگوں سے جب ماں کی گود میں ہو گا اور جبکہ پوری عمر کا ہو گا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش پر یہودیوں نے ان کی والدہ پر جو گھناؤنا الزام لگایا تھا، اس کا جواب مسیح علیہ السلام نے بنفس نفیس ماں کی گود سے دیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے اس نے اپنا رسول بنایا ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ معجزہ بیان

---

(۱) سورۃ مریم: ۲۰

(۲) سورۃ آل عمران: ۴۷

(۳) سورۃ آل عمران: ۵۹

(۴) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/۲۰۶

(۵) سورۃ آل عمران: ۴۶

ہوا ہے کہ مسیح نے ماں کی گود میں کلام کیا، حالانکہ اس حالت میں کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن سر سید اس آیت سے مسیح علیہ السلام کے کسی معجزہ کے استدلال کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کے مطابق قرآن مجید میں عیسیٰ علیہ السلام کے گہوارے میں کلام کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ قرآن کے مطابق یہودیوں نے کہا تھا کہ عیسیٰ جو کل کا بچہ ہے، اس سے ہم کیوں بات کریں؟[۱]

سر سید کی اس رائے پر نقد کرتے ہوئے مولانا امر تسری لکھتے ہیں کہ سید صاحب واقعی اس بات کے لائق داد ہیں کہ وہ اصول فطرت کو نہیں بھولتے مگر اپنی کہی ہوئی بات کو بھول جاتے ہیں۔ سورہ آل عمران کی جس آیت کا حاشیہ لکھنے کے لیے آپ بیٹھے ہیں اگر اس میں غور فرماتے تو سورہ مریم کی آیت مبارکہ کی غلط تفسیر کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور کان یکون کی گردان سے بھی جان چھوٹ جاتی۔ قرآن کریم کی آیت:

﴿ویکلم الناس فی المهد وکهلا﴾[۲]

میں آپ کا اپنا ترجمہ ملاحظہ کریں

"مسیح کلام کرے گا لوگوں سے گہوارہ میں اور بڑھاپے میں۔"[۳]

عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمانوں پر اٹھائے جانے کا انکار

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ﴾[۴]

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ! میں تجھے فوت کرنے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔

مفسرین کے نزدیک رفع عیسیٰ علیہ السلام سے مراد دنیا سے اٹھایا جانا ہے، نہ ان کی موت۔ اسی بات کی وضاحت قرآن نے کی ہے:

﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾[۵]

اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے۔

---

(۱) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۲/ ۳۱-۳۲

(۲) سورۃ آل عمران:۴۲

(۳) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۲۰۶-۲۰۷

(۴) سورۃ آل عمران:۵۵

(۵) سورۃ النساء:۱۵۷

مذکورہ آیت مبارکہ میں بہت سی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلے تو یہ بتا دیا کہ یہود و نصاریٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کا عقیدہ درست نہیں۔ دوم اس واقعہ کی اصلیت پر اطلاع دی کہ ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ سر سید اس کے قائل نہیں اور اس کو خلاف قانون قدرت سمجھتے ہیں۔ مولانا امر تسری نے اس موقع پر سر سید کے داخلی تضادات کو بھی واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سر سید کہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب کو مانتے ہیں اور کہیں اس کو اس شخص سے تشبیہ دیتے ہیں جس کی شکل مسیح علیہ السلام جیسی ہوئی۔ سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو سانپ میں اور سانپ کو عصا میں تبدیل کر سکتے ہیں، اسی طرح وہ عیسیٰ علیہ السلام جیسی شکل بھی کسی اور کی بنا سکتے ہیں۔ (۱)

انبیاء علیہم السلام کے خوابوں کا انکار

انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں، جبکہ دیگر لوگوں کے سچے خوابوں کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہا گیا ہے۔ (۲) سچے خواب نبوت کی اتباع سے آتے ہیں۔ جتنی کسی شخص کی قوت ادراک تیز اور نبوت سے قریب ہو گی، اسی قدر اس کے خواب سچے اور تعبیر طلب ہوں گے۔ مگر سر سید نے خواب کی حقیقت اور کیفیت کا انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صوفیاء کرام، علماء اسلام اور فلاسفہ عالی مقام نے ملاء اعلیٰ کا جو مطلب سمجھا ہے، وہ صرف قوت متخیلہ کا اظہار ہے۔ اس کی سچائی اور واقعیت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ سر سید کے مطابق جس چیز کا مشاہدہ نہ ہو سکے، اس کا وجود ممکن نہیں۔ (۳)

مولانا امر تسری رحمۃ اللہ علیہ اس پر یوں نقد کرتے ہیں کہ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ قویٰ ہی خواب دیکھنے میں مؤثر ہیں، لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سارے قوانین قدرت مشاہدہ اور حس میں نہیں آسکتے، کیونکہ قوانین قدرت بے شمار ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ قوانین قدرت بس وہی ہیں جو ہمارے مشاہدہ اور حس میں آچکے ہیں، شان الٰہی میں ایک طرح کی بے ادبی ہے۔ (۴)

مختصر یہ سید صاحب کے نزدیک خواب کا تعلق صرف دماغی خیالات سے ہے۔ یہ نہ ملاء اعلیٰ سے ہے اور خواب کوئی ذریعہ علم ہے، چاہے کسی کا بھی کیوں نہ ہو۔

جسمانی معراج کا انکار

---

(۱) امر تسری، تفسیر ثنائی، تفسیر ثنائی، ۱/ ۲۲۰

(۲) بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ ﷺ وسننہ وایامہ (صحیح البخاری)، کتاب التعبیر، باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ وأربعین جزءا من النبوۃ، حدیث نمبر: ۶۹۸۷، دار طوق النجاۃ، طبع اول: ۱۴۲۲ھ

(۳) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۲/ ۳۴

(۴) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۲/ ۸۶

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہ لِنُرِیَہ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾(۱)

پاک ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات کعبہ شریف سے بیت المقدس تک جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں سیر کرائی تاکہ ہم اس کو بعض نشانات دکھادیں۔

معراج کیسے ہوا؟اس حوالہ سے علماء اسلام کے ہاں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اقوال ذکر کیے جارہے ہیں:

۱۔ اسراء اور معراج دو الگ الگ واقعات ہیں۔

۲۔ اسراء اور معراج ایک ہی واقعہ کے دو نام ہیں۔

۳۔ دونوں واقعات حالتِ منام میں ہوئے۔

۴۔ دونوں واقعات حالتِ بیداری میں ہوئے۔

۵۔ ایک واقعہ حالت بیداری میں پیش آیا جبکہ دوسرا حالت نیند میں۔

۶۔ بیت المقدس تک کا سفر جاگتے میں ہوا ہے اور اس سے آگے کا آسمانی سفر حالت خواب میں۔(۲)

زیادہ تر علماء کا ماننا ہے کہ واقعہ معراج بیداری کی حالت میں جسد عنصری سمیت ہوا تھا۔ تاہم سر سید احمد خان کے نزدیک اسراء اور معراج جسمانی نہیں تھا۔ ان کے مطابق پہلی دلیل کہ لفظ "عبد" میں جسم و روح دونوں شامل ہیں، اس لیے اسراء و معراج بجسدہ ہوئی تھی، بے معنی ہے اور بہت تعجب خیز ہے، کیونکہ اس کی کوئی مثال لغتِ عرب میں نہیں ملتی۔(۳)

مولانا امر تسری اس سے متعلق لکھتے ہیں کہ تسلیم ہے کہ روح کا لفظ ہونا ضروری نہیں، لیکن ایسا قرینہ تو ضرور ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ یہ خواب کا واقعہ تھا۔ بغیر قرینہ کے لفظ عبد سے روح مع جسم ہی مراد ہو گا۔ اس لیے سر سید کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرینہ بتائیں، نہ کہ یہ فریق ثانی کی ذمہ داری ہے۔(۴)

سر سید کا کہنا ہے کہ واقعہ معراج بھی ایک خواب ہے۔ تاہم چونکہ انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ خواب بھی سچا خواب تھا۔ سر سید لکھتے ہیں کہ دراصل ہوا یوں ہو گا کہ آپ ﷺ نے خواب میں جو

---

(۱) سورہ بنی اسرائیل:۱

(۲) ابن کثیر، ابو الفداء، اسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، طبع دوم:۱۹۹۹م، ۵/۷

(۳) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۶/۸۱

(۴) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۲/۱۸۳

کچھ دیکھا ہو گا، وہ لوگوں کو بتایا ہو گا۔ ان میں یہ بات بھی ہو گی کہ آپ ﷺ نے بیت المقدس کو بھی دیکھا تھا۔ قریش بیت المقدس کے سوا اور کسی حال سے واقف نہیں تھے، اس لیے قریش نے امتحاناً آپ ﷺ سے بیت المقدس کے حالات دریافت کئے۔ چونکہ انبیاء کے خواب صحیح اور سچے ہوتے ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے خواب میں جو کچھ دیکھا تھا، بیان کر دیا۔ اسی کو راوی نے "فجلی اللہ لی بیت اللہ فرفعہ اللہ الی انظر الیہ" سے تعبیر کیا ہے۔ پس قریش کی اس مخاصمت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ حالتِ بیداری میں جسمانی طور پر بیت المقدس گئے تھے۔[۱]

مولانا امر تسری نے سر سید کے اس موقف پر بھی گرفت کی ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ گو آپ نے اس تقریر میں واقعات سے نظر اٹھا کر "ہو گی اور ہو گا" سے بہت کچھ کام لیا ہے۔ تاہم اس سے یہی ثابت ہوا کہ کفارِ مکہ کے نزدیک آپ ﷺ کا دعویٰ یہی تھا کہ آپ ﷺ حالتِ بیداری میں جسمانی طور پر بیت المقدس گئے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے آپ ﷺ کو جھٹلانا چاہا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ[۲] کو متزلزل کرنا چاہا۔ اگر یہ صرف خواب کی بات تھی تو اس میں اتنی تگ و دو کی ضرورت نہ تھی۔[۳]

قرآن کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِه﴾[۴]

اور اگر تمہیں اس میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم بھی اس جیسا ایک ٹکڑا بنالاؤ۔

مفسرین کے نزدیک مثلیت کا مطلب "مثل فی البلاغت" ہے۔ چنانچہ زمخشری[۵]، بیضاوی[۱]، امام رازی[۲]، ابن کثیر[۳]، اور سیوطی[۴] جیسے جلیل القدر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ جبکہ سر سید احمد خان اس حوالے

---

(۱) سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، ۶/ ۹۲

(۲) ابو بکر صدیق عبد اللہ بن ابو قحافہ تیمی قریشی (پیدائش: ۵۷۳ء — وفات: ۲۲ اگست ۶۳۴ء) پہلے خلیفہ راشد، عشرہ مبشرہ میں شامل، پیغمبر اسلام کے وزیر، صحابی و خسر اور ہجرت مدینہ کے وقت رفیق سفر تھے۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں ابو بکر صدیق انبیا اور رسولوں کے بعد انسانوں میں سب سے بہتر، صحابہ میں ایمان و زہد کے لحاظ سے سب سے برتر اور ام المومنین عائشہ بنت ابی بکر کے بعد پیغمبر اسلام کے محبوب تر تھے۔ عموماً ان کی کنیت "ابو بکر" کے ساتھ صدیق کا لقب لگایا جاتا ہے جسے ابو بکر صدیق کی تصدیق و تائید کی بنا پر پیغمبر اسلام نے دیا تھا۔

(۳) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۲/ ۱۸۴

(۴) سورۃ البقرہ: ۲۳

(۵) علامہ ابو القاسم محمود بن عمر بن محمد خوارزمی زَمَخْشَری معتزلی ممتاز عالم، مفسر جو تفسیر کشاف کے مولف ہیں۔ ولادت بروز بدھ ۲۷ رجب المرجب ۴۶۷ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۰۷۵ء کو زمخشر میں ہوئی۔ وفات شبِ دوشنبہ ۸ ذوالحجہ ۵۳۸ھ مطابق ۱۲ جون ۱۱۴۴ء کو ہوئی۔

سے منفرد رائے رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق بلاشبہ قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت بے نظیر و بے مثال ہے لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ قرآن منزل من اللہ ہے کیونکہ دنیا میں اور بھی ایسے کلام پائے جاتے ہیں جو اعلیٰ درجے کی فصاحت وبلاغت رکھتے ہیں، لیکن منزل من اللہ نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ خود قرآن مجید نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کا بے مثل ہونا فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ہے۔ بلکہ قرآن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ قرآن باعتبار ہدایت بے مثل ہے۔ (۵)

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے سرسید کے اس دعوے پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سرسید کا دعویٰ کہ دنیا میں اور بھی بے نظیر فصیح وبلیغ کلام پائے جاتے ہیں، محض ایک دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ قرآن صرف فصاحت وبلاغت میں بے نظیر ہی نہیں، بلکہ اس کی تحدی ہے کہ مخالفین اس جیسا کلام بنا کر دکھائیں۔ اس سے پتہ چلا کہ مثلیت سے فصاحت وبلاغت میں بے نظیر ہونا ہی مراد ہے۔ (۶)

---

(۱) مفسر قرآن۔ عبد اللہ بن عمر نام۔ بیضا میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والد اتابک ابو بکر بن سعید زنگی کے زمانے میں فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور شیراز کے قاضی مقرر ہوئے۔ پھر تبریز میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ہے اسے عموماً تفسیر بیضاوی کہتے ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک یہ بڑے پائے کی تفسیر ہے۔ اور درس نظامی میں شامل ہے۔ وفات ۱۲۸۶ء میں ۸۴ یا ۸۵ سال کی عمر میں ہوئی۔

(۲) محدث، فقیہ، فلسفی۔ پورا نام علامہ فخر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن الحسینی تھا۔ ۱۱۴۹ء میں رے ایران میں پیدا ہوئے۔ شافعی اور اشعری عقیدہ رکھتے تھے۔ آپ نے علوم دین فلسفیانہ پیرائے میں پیش کیے۔ ابن سینا اور فارابی کے معترف اور امام غزالی کے خلاف تھے۔ علم الکلام میں مشہور تصنیف اساس التقدیس ہے۔ دوسری متداول تصنیف کا نام مفاتیح الغیب ہے جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ وفات ۱۲۰۹ء میں ہوئی۔

(۳) ابن کثیر عالم اسلام کے معروف محدث، مفسر، فقیہ اور مورخ تھے۔ پورا نام اسماعیل بن عمر بن کثیر، لقب عماد الدین اور عرفیت ابن کثیر ہے۔ حافظ ابن کثیر کی ولادت ۷۰۱ھ میں مجدل میں ہوئی جو بصریٰ کے اطراف میں ایک قریہ ہے۔ تمام عمر آپ کی درس وافتاء، تصنیف وتالیف میں بسر ہوئی۔ حافظ ذہبی کی وفات کے بعد مدرسہ ام صالح اور مدرسہ تنکریہ میں آپ شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہے۔ اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی۔ ۲۶ شعبان بروز جمعرات ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۴) امام جلال الدین سیوطی (پیدائش: ۱۲ اکتوبر ۱۴۴۵ء–وفات: ۱۷ اکتوبر ۱۵۰۵ء) اصل نام عبد الرحمان، کنیت ابو الفضل، لقب جلال الدین اور عرف ابن کتب تھا۔ ایک مفسر، محدث، فقیہ اور مورخ تھے۔ آپ کی کثیر تصانیف ہیں، آپ کی کتب کی تعداد ۵۰۰ سے زائد ہے۔ تفسیر جلالین اور تفسیر در منثور کے علاوہ قرآنیات پر الاتقان فی علوم القرآن علما میں کافی مقبول ہے اس کے علاوہ تاریخ اسلام پر تاریخ الخلفاء مشہور ہے۔

(۵) سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، ۱/ ۳۰۳

(۶) امرتسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۳۹

تصور ملائکہ کی عقلی توجیہات

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے اپنے کچھ بندوں کی ذمہ داری لگائی ہے، جنہیں فرشتے کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان کی مختلف صفات بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۱)

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ، لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ﴾ (۲)

وہ تو بندے ہیں جنہیں عزّت دی گئی ہے۔ اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان کی پیدائش کے بارے میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نور سے بنایا ہے۔ (۳)

سر سید ملائکہ کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق فرشتے قدرت الٰہی کا مظہر اور اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں کا ظہور ہے۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوقات میں جو مختلف قویٰ پیدا کیے ہیں، وہی ملک یا ملائکہ ہیں۔ انہی میں ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ انسان قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا مجموعہ ہے۔ ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں، جو نیکی اور بدی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ قوائے ملکوتی انسان کے فرشتے اور قوائے بہیمی انسان کے شیطان ہیں۔ (۴)

اس حوالے سے مولانا امر تسری تحریر فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) سورۃ فاطر:۱

(۲) سورۃ الانبیاء:۲۶-۲۸

(۳) قشیری، مسلم ابن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب فی احادیث متفرقۃ، حدیث نمبر: ۲۹۹۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت

(۴) امر تسری، تفسیر ثنائی، ۱/۴۹

"سرسید کی یہ دلیل کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ انسان سے پہلے فرشتے موجود تھے۔ اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ کسی چیز کے عوارض کا وجود تب تک نہیں ہو سکتا جب تک اس چیز کا وجود نہ مان لیا جائے۔ چنانچہ فرشتوں کی موجودگی انسان سے پہلے اس چیز کی دلیل ہے کہ فرشتوں سے بہر حال وہ مراد نہیں، جو سرسید بتارہے ہیں۔"(۱)

مولانا امرتسری ایک مناظر تھے چنانچہ ان کی تحریروں میں بھی مناظرانہ اسلوب موجود ہے۔ مولانا نے سر سید کے تصور معجزات پر کڑی تنقید کی ہے۔ انہوں نے زیادہ تر بہت عمدہ تنقید کی ہے لیکن بسا اوقات ان کے قلم سے بہت کمزور دلائل بھی پیش ہوئے ہیں۔

ایک اور جگہ سرسید کو بڑھاپے کا طعنہ دیا ہے۔(۲)

بسا اوقات ان کا طرز تحریر تحقیقی اسلوب سے ہم آہنگ محسوس نہیں ہوتا۔

کہیں کہیں مولانا نے دلیل کی بجائے طنز سے بھرپور باتیں کی ہیں۔(۳)

مولانا ثناء اللہ نے سرسید پر اگرچہ کڑی تنقید کی، لیکن یہ سارا نقد سرسید کی زندگی میں تھا۔ بعد از وفاتِ سرسید مولانا نے انہیں اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے۔(۴)

نتائج وسفارشات

معجزات کے اثبات و نفی سے متعلق سرسید کا اسلوب عموماً عالمانہ اور مؤلفانہ ہے، کیونکہ سرسید کو جدید اردو نثر کا بانی بھی کہا جاتا ہے، جبکہ مولانا ثناء اللہ امرتسری بنیادی طور پر ایک مذہبی مناظر تھے۔ ان کا اسلوب مناظرانہ ہے۔ علمی اعتبار سے سرسید معجزہ اور مسمریزم کو ہم معنیٰ سمجھتے ہیں، جبکہ مولانا امرتسری کی رائے اس کے برعکس ہے۔ مولانا امرتسری سرسید کے اصولوں کے اندر رہتے ہوئے ان پر نقد کرتے ہیں۔ ایک جگہ سرسید ضرب کا معنیٰ بیان کرنا لیتے ہیں اور پھر بلا دلیل یہ لفظ سفر کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا امرتسری ضرب کا معنیٰ قرآنی سیاق وسباق کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔ سرسید صحف سماوی، اناجیل اربعہ اور فلاسفہ یونان کے افکار سے متاثر نظر آتے ہیں، جبکہ مولانا امرتسری تفسیر بالماثور کی نمائندہ شخصیت ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امت کو ہر دو طرح کے افراد کی ضرورت ہے کہ جن کی سرسید کی طرح ماڈرن اپروچ ہو اور مولانا امرتسری کی طرح ماضی کے عظیم الشان علمی ذخیرے کے محافظ اور مبلغ ہوں۔ اسی طرح کی مثال انبیاء علیہم السلام

---

(۱) ایضاً، ۱/ ۴۵-۴۶

(۲) ایضاً، ۱/ ۳۸۵

(۳) نمونہ کے لیے دیکھئے: امرتسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۳۹-۴۰، ۵۵، ۴۸۳، ۲/ ۸۹

(۴) امرتسری، تفسیر ثنائی، ۱/ ۲۰۷

میں بھی موجود ہے۔ جناب موسیٰ علیہ السلام اگر صاحبِ جلال ہیں تو جناب مسیح علیہ السلام جمالیات کی معراج ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلال و جمال دونوں کا امتزاج ہیں۔ کچھ خفیف نکات اور پہلو سر سید کے تصورات میں اور باقی ماندہ خفیف نکات مولانا امر تسری کے اسلوب میں پایا جانا ان کے غیر نبی ہونے کی دلیل ہے۔ دونوں امت مسلمہ کے نمائندے اور ضرورت ہیں۔ اپنے اپنے محل میں دونوں کا کام قابلِ قدر، لیکن ان کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

❁❁❁

قرآن مجید کی تفسیر میں سابقہ صحفِ سماویہ سے اخذ واستدلال میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسلوب

Methodology of Sahabah (رضی اللہ عنہم) for Derivation and Inference from Previous Revelatory Books in Commentary of the Holy Quran

ڈاکٹر محمد خبیب*
ڈاکٹر ضیاء الرحمن**

ABSTRACT

From the beginning, the tradition of exegesis and interpretation of Holy Quran is being practiced. Some Expert of Quranic Studies thinks that previous scriptures are also a source of interpretation of the Holy Quran. In this article, It is studied behaviors and methodology of Sahabah (رضی اللہ عنہم), in which Umar e Farooq and Jabir bin Abdullah (رضی اللہ عنہم) were adopted Tough stance about reading and copying the previous scriptures. But when we look at the stand of other companions of Prophet Muhammad (ﷺ) like Abdullah bin Amar bin Al'Aas, Abdullah bin Umar, Abdullah bin Salam, Abdullah bin Mas'ud, Anas bin Malik and Abu Huraira (رضی اللہ عنہم)etc, we got the result that their acts and methodology looks clearly supporting affirmation of reasoning from the previous scriptures.

In this article, these two cases were reviewed as a research overview and it has been proven that derivation and inference from the previous scriptures should be used in interpretation of the Holy Quran.

So that we can identified the facts those are common in previous scriptures and the Holy Quran and moreover, the Holy Quran clarified those facts in a fresh authentic ways, but the people of the Scriptures have been ignored or denied these facts. It should be questioned from them about such facts or showed them clear evidences from their own scripture. These evidences may be become a source of guidance, or establish a proof against them .

Keywords:*Derivation Tafseer e Quran,Sahabah (رضی اللہ عنہم),Previous Revelatory Books, Interpretation.*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

تعارف

تورات، زبور اور انجیل منزل مِن اللہ اور اپنے ادوار میں اپنی امتوں کے لیے رہنما کتب تھیں۔ حضور مکرم ﷺ کی بعثت کے بعد قرآن مجید عالمِ انسانی کے لیے تاقیامت منبع رشد وہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سابقہ کتبِ سماویہ کا مہیمن یعنی معیار اور کسوٹی قرار دیا ہے۔[۱] تمام صحفِ سماویہ کا منبع ایک ہونے کی بنا پر بہت سے احکام و مسائل اور واقعات کا مشترک ہونا لازمی امر ہے لیکن قرآن مجید اور موجودہ سابقہ الہامی کتب کے اسلوبِ بیان میں بہت فرق ہے۔ سابقہ کتبِ سماویہ کی نسبت قرآن مجید خاص کر سابقہ انبیاء اور اقوام کی غیر ضروری تفصیلات ذکر کرنے کی بجائے صرف اتنی بات ذکر کرتا ہے جتنی اِس اُمت کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ضروری تھی۔ سابقہ صحفِ سماویہ میں تحریف و تبدّل کے قرآنی دلائل و براہین کے بعد حضور مکرم ﷺ نے سابقہ صحفِ سماویہ پر مبنی کسی بھی بات کو ذکر کرنے کے متعلق اپنے اصحاب کو ایک اصول وضابطہ عطا کرتے ہوئے فرمایا:

"بَلِّغوا عنِّي وَلَوْ آيَةً، وَحدِّثُوا عنْ بَني إِسْرائيلَ وَلا حَرَجَ، وَمنْ كَذبَ عَليَّ مُتَعمِّدًا، فَلْيتَبَوَّأْ مَقْعدَهُ مِن النَّارِ"[۲]

میرا بات کا ابلاغ کرو، اگرچہ وہ ایک بات ہو۔ بنی اسرائیل سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن جس نے جان بوجھ کر میرے متعلق جھوٹ بولا، اسے اپنا گھرانہ جہنم میں بنالینا چاہیے۔

درج بالا حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

"فإن معنى قوله ﷺ:"وحدثوا عن بنى اسرائيل ولا حرج" أن حدثوا عنهم بما تعلمون صدقه، وهو ما يوافق القرآن، أو السنة الصحيحة، لما في الحديث عنهم من العظة والاعتبار، ولا يجوز أن يكون المعنى، حدثوا عنهم بكل حديث حق أو باطل، إذمن المعلوم ضرورة أن النبي لايجيز التحديث بالكذب، كما لايجوز أن يكون المعنى. حدثوا عنهم بما لاتعلمون كذبه"[۳]

حضور ﷺ کے فرمان بنی اسرئیل سے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کا مطلب ہے: بنی اسرائیل سے وہی باتیں بیان کیا کرو جن کا کلامِ الٰہی اور سنتِ صحیحہ کے موافق ہونا تمہیں معلوم ہو۔ آپ ﷺ کا فرمان یہ نہیں کہ ان سے ہر بات ہی بیان کر لیا کرو، وہ سچی ہو یا جھوٹی، جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ نبی ﷺ نے جھوٹ کو بیان کرنے

---

(۱) سورۃ المائدۃ:۴۸

(۲) بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل: حدیث نمبر:۳۴۶۱، دار السلام للنشر والتوزیع، بیروت، ۱۹۹۹ء، ۴/ ۱۷۰

(۳) محمد ابوزہرہ، الحدیث والمحدثون، دار الفکر العربی، قاہرہ، ۱۳۷۸ھ، ص:۱۸۹

کی اجازت نہیں دی۔ جیسا کہ یہ معنی کرنا بھی درست نہیں کہ بنی اسرائیل سے وہ بھی لے لیا کرو جس کے جھوٹ ہونے سے متعلق تم لا علم ہو۔

حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان میں ایسی روایات سے اخذ واستدلال کا طریق کار اور اسلوب بھی واضح کیا گیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہود تورات عبرانی میں پڑھتے جبکہ مسلمانوں کے لیے اس کی تشریح عربی میں کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے:

"لا تُصدِّقُوا أَهْلَ الكِتابِ وَلا تُكذِّبُوهمْ، وَقُولوا آمنَّا بِاللَّهِ وَما أُنْزلَ إِليْنَا"(۱)

تم ان کی باتوں کو سچ جانو اور نا جھوٹ۔ بس اللہ اور منزل من اللہ احکامات پر ایمان رکھو۔

درج بالا فرمانِ رسول کی وضاحت میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حدیث سے مراد اہلِ کتاب کے اپنے صحائف سے ذکر کرنے میں احتمال پایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے فی الحقیقت وہ سچی ہوں اور تم اسے جھٹلا بیٹھو اور یہ بھی ممکنات میں شامل ہے کہ وہ کذب پر مبنی ہوں اور تم تصدیق کر دو، تو اس طرح تم حرج میں پڑ جاؤ، لیکن ہم اپنی شریعت کے خلاف بات کو رد کر سکتے ہیں اور اپنے دین سے موافق بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔(۲)

یقیناً درج بالا دلیل کا جواز پر دلالت کرنا، ممانعت پر دلالت سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں کہا: تم ان کی کوئی بات نہ سنو اور نہ یہ فرمایا کہ بنی اسرائیل کی کوئی بات نقل نہ کرو۔ بلکہ ممانعت تو انہیں سچا یا جھوٹا کہنے کی ہے، لاریب یہاں ممنوع صرف وہ تصدیق ہے جو کتبِ اہلِ کتاب اور صحیفوں سے متعلق حسن ظن پر مشتمل ہو۔ اسی طرح وہ تکذیب جو بغیر کسی برہان پر مبنی ہو۔

قرآن کی تفسیر وتوضیح کی روایت شروع سے جاری ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بعض آیات سے متعلق استفسارات کا ذکر ملتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے، چنانچہ آثارِ صحابہ مآخذِ تفسیر میں تیسرا اہم مقام رکھتے ہیں۔ وقت کی ضرورتوں کے ساتھ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن، حدیث اور آثارِ صحابہ کے علاوہ بھی بعض اسلوب اختیار کرنا ناگزیر ہوئے۔ چنانچہ بعض اصولیین کے نزدیک تفسیرِ قرآن کا ایک اسلوب اور مآخذ سابقہ صحفِ سماویہ بھی ہیں۔ اسی نقطہء نظر کو با دلائل ثابت کرنے کے لیے اس موضوع پر صحابہ کرامؓ کی فلاسفی پر غور کیا گیا ہے کہ کیا واقعی ضرورت تھی کہ کلامِ الٰہی سے بعض آیات کی تشریح وتوضیح میں سابقہ الہامی کتب سے مدد لی جائے؟ نورِ نبوت سے فیض یافتگان اصحاب نے قرآن کی تفسیر میں سابقہ کتبِ سماویہ سے اخذ واستدلال کیا ہے۔ یہاں اکابر اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل، اسلوب ومنہج ذکر کیا جارہا ہے۔

---

(۱) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب تفسیر القرآن، باب قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا، حدیث نمبر: ۴۴۸۵، ۶/۲۰

(۲) عسقلانی، احمد بن علی بن حجر، ابو الفضل، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۷۹ھ، ۸/۱۷۰

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

"حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ" کے راوی سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَلِهذا كانَ عبدُ اللهِ بنِ عَمرو قَد أصابَ يَوم اليرموكِ زَامِلَتَينِ مِن كُتبِ أهلِ الكتابِ، فَكانَ يُحدثُ مِنهُمَا بِمَا فَهِمَهُ مِن هذَا الحَديثِ مِن الإذنِ فِي ذَلِكَ"(۱)

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اسی حدیث سے اجازت سمجھنے کی بنا پر جنگ یرموک سے اہل کتاب کی دستیاب شدہ دو بوجھ کتب سے روایت کرنے لگے تھے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ "تفسیر بغوی" میں حدیثِ مبارکہ "حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ" سے استدلال کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اہل کتاب اور کتب اہل کتاب سے بیان کرنے اور قرآن کی تشریح و توضیح میں اقوالِ صحابہ کرام کی قبولیت پر استدلال کرتے ہیں اور اسی جواز سے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کبھی کبھی کتب اہل کتاب سے بیان کرتے تھے، جو انہیں یوم یرموک ملی تھیں۔(۲)

امام ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی الفاظ کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے تذکرہ میں آخری الفاظ یہ نقل کرتے ہیں:

"فَكَانَ يُحَدِّثُ مِنْهُمَا بِمَا فَهِمَهُ"(۳)

یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کتب اہل کتاب سے مطالعہ کرتے، غور و فکر کرتے اور دلائل تلاش کرتے۔ اب سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا ایک استدلال بطور مثال ملاحظہ کریں، جو انہوں نے تورات سے استدلال کے طور پر بیان کیا۔ روایت یہ ہے:

"قرآن مجید کی یہ آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ تورات میں اس طرح ہے: اے پیغمبر! آپ شاہد، مبشر اور ان پڑھ لوگوں کے پشت پناہ بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں۔ تم میرے بندے اور رسول ہو۔ آپ کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے والی ہستی سے گردانا گیا ہے۔ آپ بدخو، سخت دل اور آوارہ گرد نہیں۔ جب تک آپ کفر و شرک کی ملت کو سیدھے راستے پر نہ لگا دیں اور ملت لا الٰہ الا اللہ نہ پکار اٹھے، اللہ آپ کو موت سے ہم کنار نہیں

---

(۱) ابنِ تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبد الحلیم، مقدمہ فی اصول التفسیر، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۰ء، ص:۴۲

(۲) بغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود، معالم التنزیل فی تفسیر القرآن (تفسیر البغوی)، دار طیبہ للنشر والتوزیع، ۱۹۹۷ء، ۱/۱۶

(۳) ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، ابو الفداء، تفسیر القرآنِ العظیم (تفسیر ابن کثیر)، دار طیبہ للنشر والتوزیع، ۱۹۹۹ء، ۱/۸

کرے گا۔ اس کلمے کے سبب اللہ تعالیٰ اندھی آنکھیں، بہرے کان اور غافل دلوں کو کھول دے گا۔[۱]

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقتِ نبوت پر تورات سے استدلال کرنا اور قرآنی آیت کی وضاحت پر تورات سے دلیل لینا، تفسیرِ قرآن میں سابقہ کتب سماویہ سے اخذ واستدلال پر واضح دلیل ہے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے متعلق محدثین ومفسرین ذکر کرتے ہیں کہ یہود کے بہت بڑے عالم تھے۔ قبول اسلام کے بعد حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بشارتِ بہشت سے نوازا۔ قرآنی آیات ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى مِثْلِهِ﴾[۲] اور ﴿وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾[۳] ان کے متعلق نازل ہوئیں۔ رجم کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر یہود نے جب کہا کہ ہم تورات میں کچھ نہیں پاتے تو اہل کتاب کو حق پر قائل کرنے کے لیے انہیں کی کتب سے اخذ واستدلال کے لیے فوراً بولے: ﴿فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾[۴]

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا ابنِ سلام رضی اللہ عنہ سے متعلق تذکرۃ الحفاظ میں بیان ہے:

"أنه جَاءَ إِلَى النَّبِي فَقَالَ: إِنِّي قَرأتُ القُرآنَ وَالتَّورَاةَ فَقَالَ: "اِقرأ هَذا لَيلة وَهَذا لَيلة"[۵]

عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور تشریف لا کر استفسار کرنے لگے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کی تلاوت کرتا ہوں اور تورات کی بھی، تو حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے: ایک دن تلاوتِ قرآن کر لیا کریں۔ ایک دن تورات کا مطالعہ کر لیا کریں۔

درج بالا فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے استشہاد کرتے ہوئے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی درستگی کی بنیاد پر تورات میں بار بار غور کرنے سے متعلق رخصت موجود ہے:

"إن صَحَّ فَفِيهِ الرخصَة فِي تَكرِيرِ التَّوراةِ وَتَدبرِهَا"[۶]

---

(۱) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب تفسیر القرآن، باب انا ارسلناک شاہدو مبشر او نزیرا، حدیث نمبر: ۴۸۳۸، ۶/ ۱۳۵

(۲) سورۃ الاحقاف: ۱۰

(۳) سورۃ الرعد: ۴۳

(۴) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، باب قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوہا ان کنتم صدقین، حدیث نمبر: ۴۵۵۶، ۶/ ۳۷

(۵) ذہبی، محمد بن احمد، تذکرۃ الحفاظ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۸ء، ۱/ ۵

(۶) ایضاً

اب سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل و منہج ملاحظہ کرتے ہیں، کس انداز سے انہوں نے تورات سے استدلال کیا۔

"حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: یہودی کمیونٹی زنا کرنے والے ایک مرد اور عورت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اطہر میں لے کر آئے۔ دریافت کیا: تم ایسے لوگوں سے کیا سلوک کرتے ہو؟ کہنے لگے کہ ان کے چہروں پر کالک لگا کر چھتر پولا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دریافت کیا کہ تورات میں رجم نہیں ہے؟ کہنے لگے کہ ہم تو کوئی ایسا حکم نہیں پاتے۔ یہ سن کر سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ اے یہودیو! تم جھوٹے ہو۔ بھلا اگر سچے ہو تو لاؤ تورات اور پڑھو۔ وہ تورات لائے۔ پڑھنے والے نے پڑھتے پڑھتے آیتِ رجم پر اپنا ہاتھ رکھ لیا اور آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنے لگا، رجم کی آیت نہیں پڑھی، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پڑھنے والے کا ہاتھ ہٹا کر کہنے لگے: یہ کیا ہے؟ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے یہود کہنے لگے کہ یہی رجم کی آیت ہے۔ تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کا یہی فیصلہ جاری کر دیا، پس وہ دونوں سنگسار کر دیے گئے۔"(۱)

سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اہلِ یہود کو تورات کا درست حکم بتانے پر مجبور کرنے کے لیے ﴿فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا﴾ کہنا اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید حاصل ہونا اور پھر دلیل کے سامنے یہود کا بے بس دکھائی دینا، دلالت کرتا ہے کہ تفسیرِ قرآن میں یہود و نصاری کو دعوت اسلام کی غرض سے بائبل سے استدلال کیا جائے۔ تورات، زبور اور انجیل سے اہل کتاب پر استدلال، دین اسلام کی صحت اور اہل کتاب کے باطل اعتقادات پر رد کے لیے سنّتِ جلیلہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ﴿قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی کہا جا رہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہما

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"أنَّه لَقِيَ كَعباً فَجَعلَ يُحدثه وَيَسأله فَقَالَ كَعب: مَا رَأيتُ أحَدًا لَم يَقرأ التَّوراة أعلَم بِمَا فِيها مِن أبي هُريرة" (۲)

(۱) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب تفسیر القرآن، باب قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوہا ان کنتم صدقین، حدیث نمبر:۴۵۵۶، ۶/۳۷

(۲) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۱/۳۰

حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے مختلف امور پر گفت وشنید کی اور مختلف سوالات بھی کیے تو پھر آخر یہ کہنے لگے کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تورات کا علم رکھنے والے کسی شخص کو نہیں جانتا۔

دونوں اصحاب کی یہ گفتگو اور پھر دونوں اصحاب کا کتب اہل کتاب سے مختلف مواقع پر استدلال کرنا، تفسیر قرآن میں بائبل سے اخذ واستدلال پر دلالت کرتا ہے۔

مفسرِ قرآن علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ عبد اللہ ابنِ سلام اور کعب ابنِ احبار رضی اللہ عنہما جیسے اکابرین کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ينقلون منها ما ينقلون من الأخبار ولم ينكر ذلك ولا سماعه أحد من أساطين الإسلام ولا فرق بين سماع ما ينقلونه منهم وبين قراءته فيها وأخذه منها وقد رجع إليها غير واحد من العلماء في إلزام اليهود والاحتجاج عليهم ببعض عباراتها"[1]

ایسے اکابر اصحابِ رسول یہود سے سابقہ کتبِ مقدسہ پر مشتمل اخبار ہی نقل کرتے ہیں، کوئی بھی مفکرِ اسلام اس کا منکر نہیں ہے۔ ان سے نقل کردہ کے سماع، قرأت اور ان سے اخذ کرنا برابر امور ہیں۔ اہلِ کتاب کی طرف بہت سے علماء نے رجوع کیا ہے اور انہی کی بعض عبارات کے ذریعے ان کے خلاف حجت پکڑی ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے سلاطین اور والیان سے خط وکتابت کی ضرورت پیش آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو دعوتی خطوط لکھے۔ یہود سے خط وکتابت کے لیے عبرانی اور سریانی زبان کے ماہر کی ضرورت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوئے:

«يا زيْدُ، تعلَّمْ لي كتَابَ يَهُود، فَإِنِّي واللهِ ما آمنُ يهُودَ علَى كتَابِي»[2]

اے زید! یہود کی زبان سیکھ لے کیونکہ میرے پاس یہود کے خطوط آتے ہیں جن کو میں کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ مجھے یہود پر اطمینان بھی نہیں۔

تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے چند دنوں میں عبرانی اور سریانی میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ خطوط پڑھ لیتے اور جواب لکھ دیتے تھے۔ ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ "السیرۃ النبویہ" میں ایک تحریر کا ذکر کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کو لکھی۔ اس تحریر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے لیے تورات سے اخذ واستدلال کیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہی کوششوں کا

---

(۱) الوسی، شہاب الدین محمود بن عبد اللہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، ۲۹۲/۱۰

(۲) احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر: ۲۱۶۱۸، مؤسسۃ الرسالہ، ۲۰۰۱ء، ۴۹۰/۳۵

ماحاصل تھا کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما جیسے سریانی زبان، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے سریانی و عبرانی دونوں زبانوں کے ماہر پیدا ہوئے۔ خط کا مفہوم درج ذیل ہے:

"رحمٰن اور نہایت مہربان خدائے بزرگ و برتر کے نام سے شروع: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اور برادر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تحریر ہے۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر منزل من اللہ کتاب کا مصدق ہوں۔ اے جماعتِ توراۃ! آگاہ ہو جاؤ خدائے بزرگ و برتر نے تم سے کہا ہے جو بات تم تورات میں بھی پڑھ چکے ہو کہ محمد خدائے بزرگ و برتر کا مبعوث کنندہ ہے اور اس کے ساتھی کفار پر بہت شدید ہیں لیکن باہم نہایت رحم دل، تم انھیں اس حال میں دیکھو گے کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور رضا ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی شناخت سجود کے سبب عیاں ہو گی۔ تورات میں ان کا یہ وصف جبکہ انجیل میں ان کی توصیف اس کھیتی کی طرح، جس کے بیج پیدا ہوئے، مضبوط ہوئے، موٹے ہوئے، اپنی ٹہنیوں پر کھڑے ہو گئے۔ کاشت کرنے والوں کو یہ کھیتی خوش جبکہ کفار کو غیض و غضب دلاتی ہے۔ اہلِ ایمان اور نیک اعمال بجالانے والوں سے خدائے بزرگ و برتر نے بڑی بخشش اور بڑے اجر کا عہد باندھ رکھا ہے۔ میں تمہیں اسی خدائے بزرگ و برتر کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، پھر اس چیز کا واسطہ دیتا ہوں جو تمہاری طرف منزل من اللہ ہے۔ اسی ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تم سے پہلے لوگوں کو، جن کی تم نسل سے ہو، من و سلویٰ کھلایا اور اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تمہارے آباء واجداد کے لیے سمندر کو خشک کر دیا، یہاں تک کہ انہیں فرعون اور اس کے چیلوں سے نجات دی، تم مجھے یہ بتلاؤ کہ کیا تم منزل من اللہ تورات میں لکھا پاتے ہو کہ تم محمد پر ایمان لاؤ؟ اگر تم یہ بات موجود نہیں پاتے تو پھر تم پر کوئی زور و جبر نہیں۔ تحقیق گمراہی کی بنسبت ہدایت عیاں ہو چکی۔ میں تمہیں خدائے بزرگ و برتر اور اس کے نبی کی طرف بلاتا ہوں۔"(۱)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں:

"اہلِ کتاب سے کسی چیز کے متعلق نہ پوچھو، وہ تو خود گمراہ ہو چکے ہیں، تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ان سے مسئلہ پوچھ کر تم کسی باطل چیز کی تصدیق کر دو گے یا کسی حق کو جھٹلا دو گے۔ اگر

(۱) ہشام، عبد الملک بن ہشام بن، السیرۃ النبویۃ، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر، ۱۹۵۵ء، ۱/ ۵۴۵

آج تمہارے درمیان موسیٰ علیہ السلام بھی حیات ہوتے، وہ بھی میری اطاعت کے علاوہ کوئی حل نہ پاتے۔"(۱)

لیکن اصولیین نے اس مروی کو ضعیف کہتے ہے:

"إسناده ضعيف لضعف مجالد: وهو ابن سعيد"(۲)

کئی اسناد سے یہ روایت ذکر ہوئی ہے اور انہیں طرق، شواہدات اور متابعات کی بنا پر محدثین کے مطابق یہ روایت درست ہے۔ امام ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَاسْتَعْمَلَهُ فِي التَّرْجَمَةِ لِوُرُودِ مَا يَشْهَدُ بِصِحَّتِهِ مِنَ الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ" (۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ان الفاظ سے باب کا قیام اس روایت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو تورات پڑتے دیکھا، سخت برہم ہوئے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ:

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اہلِ کتاب سے لی ہوئی ایک کتاب لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر ہو کر پڑھنا شروع ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اظہارِ ناراضگی فرماتے ہوئے کہنے لگے: اے عمر! کتاب میں کیا تلاش کرتے ہو؟ اپنی جان کے مالک خدائے بزرگ وبرتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں، یقیناً میں صاف ستھرا کامل نظامِ حیات لے کر آیا ہوں، لہٰذا اہلِ کتاب سے کچھ بھی دریافت نہ کرو۔ کیونکہ وہاں سے کوئی حق بات ملے لیکن تم اسے جھوٹ سمجھ بیٹھو۔ تمہیں کوئی جھوٹ بیان کریں اور تم اسے سچا جان لو۔ اپنی جان کے مالک خدائے بزرگ وبرتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج موسیٰ علیہ السلام بھی حیات ہوتے، وہ بھی میری اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رکھتے۔"(۴)

درج بالا روایت، حدیث کی معتبر کتبِ حدیث میں مختلف اسناد اور الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ مندرج ہے۔ سنن دارمی میں بھی چند الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ موجود ہے۔(۵)

---

(۱) امام احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر:۱۴۶۳۱، ۲۲/ ۴۶۸

(۲) امام احمد بن حنبل، مسند، ۲۲/ ۴۶۸

(۳) عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ۱۳/ ۳۳۴

(۴) امام احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر:۲۳، ۱۵۱۵۶/ ۳۴۹

(۵) دارمی، محمد بن عبد الرحمٰن، سنن الدارمی، کتاب العلم، باب ما یتقی من تفسیر حدیث النبی ﷺ، وقول غیرہ عند قولہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر:۴۴۹، دار المغنی للنشر والتوزیع، المملکۃ العربیۃ، السعودیۃ، ۱۴۱۲ھ، ۱/ ۴۰۳

مصنف "فتح المنان شرح سنن دارمی" اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں:

"درج بالا سندِ حدیث مجالد کے علاوہ صحیح سند کی شروط پورا کرتی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے سندِ مجالد سے بیان حدیث کو متابعات و شواہد میں ذکر کیا ہے لہٰذا" صحیح لغیرہ "کہلائے گی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصحیح کی کتاب الاعتصام کا باب: باب قولِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "لاتسئلوااهل الكتاب عن شيءٍ" الفاظ کے ساتھ ہے۔ ان الفاظ کا چناؤ درج بالا حدیث کی سند کی قوت پر دلالت کرتا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: یہ الفاظ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث کا ترجمہ ہیں جو احمد اور بزار نے ان سے بیان کی۔ پھر وہ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں، پھر فرکہتے ہیں: تمام راوی سوائے مجالد کے ثقہ ہیں اور وہ ضعیف ہے، لیکن امام بخاری ترجمۃ الباب میں یہی حدیث نقل کرتے ہیں، کیوں کہ اس حدیث کے صحیح حدیث کے درجے تک پہنچنے کے اور بھی شواہد ہیں۔"(۱)

الشیخ خطیب التبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوۃ المصابیح میں سنن دارمی کی درج بالا حدیث اسی سند اور متن کے ساتھ ذکر کی، شیخ البانی رحمۃ اللہ اس حدیث پر حکم "حسن" لگاتے ہیں۔ ایک اور مقام پر شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ درج بالا حدیث کو "حسن" کہنے کی وجہ بہت زیادہ قوی شواہد کا کہتے ہیں۔ پھر مختلف سندوں کے چھ شواہد بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وجملة القول: أن مجيء الحديث فى هذه الطرق المتباينة والألفاظ المتقاربة لمما يدل على أن مجالد بن سعيد قد حفظ الحديث فهو على أقل تقدير حديث حسن"(۲)

جملۃ القول یہ ہے کہ مجالد بن سعید کی بیان کردہ حدیث کا متباین طرق اور متقارب الفاظ کے ساتھ بیان ہونا کم از کم درجہ "حسن" پر دلالت کرتا ہے۔

آپ کے اظہارِ ناراضگی کے اثرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری زندگی محسوس کرتے اور کراتے رہے ہیں۔ دو امثلہ پیشِ خدمت ہیں۔

سوس کا رہنے والا قبیلہ عبد القیس کا ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چھڑی اسے دے ماری۔ وہ اپنا قصور دریافت کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ یوسف کی آیات ﴿لَمِنَ الْغَافِلِينَ﴾ تک تین مرتبہ تلاوت کیں اور تینوں مرتبہ چھڑی سے اسے ضرب لگائی۔ وہ

---

(۱) عبداللہ بن عبد الرحمٰن، فتح المنان شرح و تحقیق کتاب الدارمی المسمّی بالمسند الجامع، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۹ھ، ۳/ ۱۹۱۔۱۹۲

(۲) البانی، محمد ناصر الدین، ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل، کتاب الوقف، الفصل الاول، حدیث نمبر: ۱۵۸۹، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ، ۶/ ۳۴-۳۸

ہر بار اپنا قصور دریافت کرتا رہا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُسے کہنے لگے کہ تم نے دانیال کی کتاب لکھی ہے؟ کہنے لگا کہ ہاں لکھی ہے، لیکن آپ جو حکم کریں گے میں ویسا کرنے کو تیار ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گرم پانی اور روئی سے اس کے الفاظ صاف کر دے۔ ایسی تحریروں کو خود پڑھنا نہ کسی کو پڑھانا۔ اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو ایسی سزا دوں گا کہ عبرت ہو جاؤ گے۔ اب میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بھی سنتا جا۔ میں اہلِ کتاب کی ایک کتاب لکھی اور اسے چمڑے میں لپیٹے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور آیا۔ حضور رضی اللہ عنہ کا چہرہ غضب زدہ ہو گیا۔ لوگوں کو جمع کرنے کے لیے اعلان کر دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ ہتھیار بند انصار نے منبر گھیرے میں لے لیا کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: لوگو! مجھے جامع کلمات دیے گئے ہیں۔ میں اللہ کے دین کی بہت خوبصورت باتیں لایا ہوں۔ تم بہک نہ جانا اور گہرائی میں اترنے والے تمہیں بہکا نہ دیں۔ حضرت عمر کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مَیں اللہ کے رحمٰن، اسلام کے دین، آپ کے پیغمبر ہونے پر دل سے راضی۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ (۱)

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا دوسرا واقعہ درج ذیل ہے:

حافظ ابو بکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی کہتے ہیں:

> "عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں حمص سے چند آدمی بلائے۔ ان میں سے دو اشخاص نے یہود کی چند منتخب باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسی باتوں کے متعلق دریافت کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے کہنے لگے کہ شائد تم نے ان سے کچھ باتیں لکھ رکھی ہیں۔ سنو! میں اس سے متعلق فیصلہ کن واقعہ سناؤں۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر زمانہ میں خیبر گیا۔ وہاں ایک یہودی کی باتیں مجھے پسند آئیں۔ میری درخواست پر وہ باتیں مجھے لکھ دیں گئیں۔ واپس آکر میں یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تحریر مجھ سے منگوائی۔ میں حاضرِ خدمت ہو کر تحریر پڑھنے لگا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ناراض اور غضب میں ہیں۔ میری زبان مزید ایک لفظ پڑھنے سے قاصر ہو گئی اور مارے خوف کے میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریر کو پکڑ کر الفاظ مٹانا شروع ہوئے اور ساتھ ساتھ فرماتے جاتے کہ یہ خود آپ گمراہ ہو چکے اور دیگر کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک لفظ تک مٹا دیا۔ یہ واقعہ سنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ اگر تم نے بھی ان سے کچھ تحریر کیا ہوتا تو تم کو عبرت ناک سزا دیتا۔ انہوں نے کہا اللہ

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴/ ۳۶۷-۳۶۸

کی قسم ہم ان سے کچھ بھی احاطہ تحریر میں نہیں لائیں گے۔ تب انہوں جنگل جاوہ تختیاں گھڑا کھود کر دفن کر دیں۔"(۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فرمان اور ان کے عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اے مسلمین کی جماعت! تم یہود و نصاریٰ سے کیوں سوال کرتے ہو حالانکہ اس کے نبی پر نازل کتاب تمہارے پاس موجود ہے، جسے میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ اس کتاب میں باطل کی ملاوٹ نہیں۔ میں تمہیں یہ بات بھی بیان کر چکا ہوں: یہود و نصاریٰ نے کلام الٰہی تبدیل کر دیا ہے۔ وہ حقیر سی قیمت کے بدلے اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔"(۲)

اب سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا عمل مشاہدہ کریں:

"سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہود کا گروہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہو کر عرض کرنے لگا۔ اے ابو القاسم! ہم آپ سے ایک ایسی بات پوچھنے والے ہیں جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے پاس علم نہیں ہو سکتا۔ تو پھر انہوں نے اس کھانے کے متعلق دریافت کیا جو نزولِ تورات سے پہلے سیدنا اسرائیل علیہ السلام اپنے آپ پر حرام قرار دے دیے چکے تھے۔ حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے۔ تورات نازل کرنے والے رب کی قسم! حضرت اسرائیل یعقوب علیہ السلام کو ایسا شدید عارضہ لاحق ہو گیا تھا کہ بیماری نے جب طول پکڑا تو حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اللہ کے حضور نزر پیش کی کہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے شفاء عطا ہونے پر محبوب ترین پینے کی چیز اور محبوب ترین کھانے کی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیں گے۔ تو ہاں! حضرت یعقوب علیہ السلام کا محبوب ترین طعام اونٹ کا گوشت اور پینے کی محبوب ترین چیز اونٹنی کا دودھ تھا۔ یہ جواب سن کر یہود کہنے لگے، اے اللہ! انہوں نے سچ کہا۔"(۳)

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ "یَا مَعْشَرَ المسْلِمِین" کہہ کر عام مسلمانوں کی جماعت سے مخاطب ہیں۔ محرّف و مبدّل کتاب کو ماننے والوں سے سوال کرنے سے روک رہے ہیں اور قرآن کی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کا

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴/۳۶۸

(۲) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الشہادات، باب لا یُسأل اہل الشرک عن الشہادۃ وغیرہا، حدیث نمبر: ۲۶۸۵

(۳) امام احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر: ۲۴۷۱، ۴/۲۷۷

عمل نظر آتا ہے کہ وہ اہلِ کتاب وکتبِ اہل کتاب سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتبِ اہلِ کتاب میں غور وفکر اور ان سے اخذ واستدلال ایک محقق عالم کے لیے تو جائز ہے لیکن عام آدمی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مترجم وشارح الجامع الصحیح للبخاری مولانا داؤد راز رقمطراز ہیں:

"تمہارے پاس اللہ کا کلام قرآن مجید موجود ہے اور اس کی شرح، حدیث تمہارے پاس موجود ہے، پھر بڑے شرم کی بات ہے کہ تم ان سے پوچھو۔ بہت سے علماء نے اس حدیث کی رو سے تورات وانجیل اور اگلی آسمانی کتب کا مطالعہ کرنا بھی مکروہ رکھا ہے، کیوں کہ ان میں تحریف اور تبدیلی ہوئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ضعف الایمان لوگوں کا اعتقاد بگڑ جائے، لیکن جس شخص کو یہ ڈر نہ ہو اور وہ اہلِ کتاب سے مباحثہ کرنا چاہے اور اسلام پر جو وہ اعتراض کرتے ہیں، ان کا جواب دینا چاہے تو وہ اجر کا حق دار ہے۔"(۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک یہودی کے تورات سے استدلال کے ذریعے ایمان لانے کا ذکر کرتے ہیں کہ:

"خدائے بزرگ وبرتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی آدمی کے بہشت داخلہ کے لیے بھیجتے ہیں، اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلیسا میں داخل ہوئے تو وہاں مجلسِ یہود میں ایک یہودی تورات کی تلاوت کر رہا تھا۔ دوران تلاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پر پہنچا تو رک گیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب کس چیز نے تمہیں تلاوتِ تورات سے روک دیا ہے۔ وہاں موجود ایک مریض آدمی کہنے لگا کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا تذکرہ ہے تو یہ رک گیا ہے پھر اُس مریض آدمی نے آگے بڑھ کر اس سے تورات پکڑ لی اور تلاوت کرنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صفاتِ امتِ محمدیہ پر پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوا کہ یہ تیری اور تیری امت کی صفات ہیں۔ ساتھ ہی اس نے شہادت دی: سوائے خدائے بزرگ وبرتر کے کوئی الٰہ نہیں اور بے شک آپ رسول اللہ ہیں۔"(۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

---

(۱) راز، محمد داؤد، صحیح البخاری (ترجمہ وتشریح)، مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، ھند، ۸/ ۵۱۰-۵۱۱

(۲) امام احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر: ۳۹۵۱، ۷/ ۶۴

سیدنا انس رضی اللہ عنہ حضور مکرم ﷺ کے ایک خدمت گزار یہودی کے بائبل سے استدلال کی بنا پر اسلام لانے کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ایک یہودی لڑکا حضور مکرم ﷺ کا خادم تھا، اسے کوئی مرض لاحق ہو گیا۔ آپ ؐ مزاج پرسی کے لیے گئے۔ آپ ﷺ اس کے سرہانے توراۃ پڑھتے اس کے والد کو دیکھ کر فرمانے لگے: اے یہودی! میں تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کرنے والے رب کی حلف دیتا ہوں، کیا آپ توراۃ میں میری تعریف، میرے بارے میں تفصیل اور میرے ظاہر ہونے کی جگہ وغیرہ کا تذکرہ پاتے ہو؟ یہودی نے کہا: نہیں۔ مگر اس نوجوان لڑکا کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم لوگ تمہاری تعریف، تمہارے بارے میں وضاحت اور آپ کی آمد کا مقام وغیرہ پاتے ہیں اور میں شہادت دے رہا ہوں کہ سوائے خدائے بزرگ و برتر کے کوئی الٰہ نہیں اور تم رسول اللہ ہو۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے: اس یہودی کو سرہانے سے اٹھا دو۔ اپنے بھائی کے ولی اور وارث بن جاؤ۔"(۱)

حضرت عاصم بن کلیب رضی اللہ عنہ

سیدنا عاصم بن کلیب رضی اللہ عنہ تورات، انجیل اور قرآن کی تلاوت کرنے والے یہودی کے اسلام لانے کی داستاں ذکر کرتے ہیں، جس نے آپ ﷺ کی صداقت پر تورات سے استدلال کیا۔ کہتے ہیں:

"نبی مکرم ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، اسی اثنا میں مسجد میں چلتے ہوئے ایک یہودی کی طرف دیکھا اور بلایا۔ چنانچہ ایک آدمی یہود میں سے شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ کہتے ہیں وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر اس نے صرف یہی کہا: یا رسول اللہ! مگر حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم میرے رسول اللہ ہونے کی شہادت دیتے ہو؟ وہ انکاری رہا۔ آپ ﷺ نے استفسار کیا: تم توراۃ پڑھتے ہو؟ کہنے لگا، پڑھتا ہوں۔ فرمایا: انجیل؟ کہنے لگا، پڑھتا ہوں۔ پوچھا: قرآن پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: اپنی جان کے مالک خدائے بزرگ و برتر کی قسم، چاہوں تو پڑھ سکتا ہوں۔ حضور ﷺ اسے حلف دے کر کہنے لگے کیا تم میرے متعلق توراۃ و انجیل میں پڑھتے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ ہم اسے تیری مثل پاتے ہیں اور تیری

(۱) بیہقی، احمد بن الحسین بن علی بن موسی، دلائل النبوۃ و معرفۃ احوال صاحب الشریعۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۰۵ھ، ۲۷۲/۶

زندگی کی مثل ہی اس کی زندگی پاتے ہیں اور اسے اسی جگہ سے ظاہر ہونا پاتے ہیں جہاں سے تو ظاہر ہوا ہے۔"[1]

سیدنا عبد اللہ بن مسعود، سیدنا انس، سیدنا عاصم بن کلیب رضی اللہ عنہم کے بیان کردہ درج بالا مشاہدات سے پتا چلتا ہے کہ حضور ﷺ کے ہوتے ہوئے سابقہ صحفِ سماویہ میں ان کی صفات و دیگر براہین سے مستفید ہو کر کئی اہلِ کتاب نے ہدایت حاصل کی۔ اسلام کے سچ ہونے پر سابقہ صحف کے اِن براہین کو بعض اہلِ کتاب چھپانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن صحابہ کرام اور حضور ﷺ دینِ اسلام کی سچائی پر سابقہ صحفِ سماویہ سے دلائل پیش کرتے ہیں تو وہ دلائل مؤثر ہونے کی بنا پر مذہبِ اسلام قبول کرانے کا سبب بنتے ہیں۔

حاصلِ مطالعہ

درج بالا بحث سے پتا چلتا ہے کہ سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اور منہج نہایت سخت رہا، جن لوگوں کے پاس سابقہ صحفِ سماویہ میں سے کچھ پایا، ان کا سختی سے نوٹس لیا، اور ساتھ ساتھ ان کو اپنا واقعہ بھی سنایا جو حضور ﷺ کے ساتھ ان کو درپیش ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایات کے راوی سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ خود سیدنا جابر بن عبد اللہ کے بیانات بھی ایسے ہی ملتے ہیں، جس میں سابقہ صحفِ سماویہ کو پڑھنے اور نقل کرنے کے متعلق سخت موقف اپنایا گیا ہے۔ لیکن جب ہم دوسرے اصحابِ رسول، مثلاً عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، عبد اللہ بن سلام، عبد اللہ بن مسعود، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کا اسلوب اور منہج سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال کے اثبات پر صاف دکھائی دیتا ہے تو دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

پہلی: ممانعت کے واقعات شروع اسلام کے ہیں، لیکن جب اسلامی تعلیمات عام ہو گئیں۔ اسلامی اور سابقہ صحف کہ تعلیمات کے مل جل جانے اور نو مسلموں کے عقیدتاً پھسلنے کا اندیشہ جاتا رہا تو اجازت مل گئی لہٰذا اصحابِ رسول قرآنی بیانات کی تفسیر میں سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بنی اسرائیل سے بغیر کسی حرج کے بیان کر لیا کرو مطلب کہ اہلِ کتاب سے حدیث لینے میں تنگی اور سختی میں نہ پڑو۔ آپ ﷺ سے مروی حدیث گزر چکی، جہاں اہلِ کتاب سے اخذ کرنے، سابقہ صحف دیکھنے سے متعلق زجر و توبیخ ذکر ہے۔ پھر اس مسئلہ میں وسعت حاصل ہوئی۔ گویا

---

(۱) بزار، احمد بن عمرو، مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار، حدیث نمبر: ۳۷۰۰، مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ، ۲۰۰۹ء، ۹/ ۱۴۴

یہ ممانعت اسلامی احکام اور دینی اصول و قواعد کے استقرار سے پہلے فتنے کے خوف سے ہے۔
پھر جب یہ خوف ذائل ہو گیا تو اجازت دے دی گئی۔"(۱)

دوسری صورت یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے سابقہ کتبِ سماویہ کو پڑھنے، حفظ کرنے یا دلائل تلاش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اجازت ہے تو صرف آئمہ راسخین کو۔ حضور ﷺ حضرت عمر فاروق سے سابقہ آسمانی صحیفہ دیکھ کر ناراض ہو رہے ہیں تو دوسری طرف سابقہ صحفِ سماویہ کے بہت بڑے عالمِ دین سیدنا عبد اللہ بن سلام ﷺ کو تورات کا مطالعہ اور استدلال کے لیے اجازت مرحمت فرما رہے ہیں اور آپ ﷺ کی موجودگی میں تورات منگوا کر اہلِ یہود کے خلاف حجت پکڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

اسی بات کو حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ مختصر مگر جامع تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"آپ ﷺ کے نفی والے فرامین سے کراہت تنزیہی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ کراہت تحریمی اور پھر راسخین اور غیر راسخین کے درمیان فرق بھی ظاہر ہو رہا ہے، کہ علماء راسخین کے علاوہ کسی سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال کرنے کا حکم نہیں ہے۔ احادیثِ مبارکہ ائمہ کے تورات سے اخذ کرنے اور آپ ﷺ کی سچائی کے لیے یہود کو انہیں کی کتب سے دلائل دکھانے پر دلالت کرتی ہیں۔"(۲)

اسی طرح امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہی سوچ و فکر کو پروان چڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قرآن کے نزول کے بعد تورات کا پڑھنا اور حفظ کرنا کسی کے لیے مشروع نہیں ہے، کیوں کہ وہ محرّف و مبدّل اور منسوخ العمل ہے اور اس کتاب میں سچ باطل سے مختلط ہے، پس اجتناب کریں۔ لیکن یہود سے بحث و مباحثہ اور ان کی تردید کی غرض سے اجازت صرف ایک عالم کے لیے ہے۔"(۳)

خلاصۃ البحث

(۱) عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، قولہ باب ماذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر:۳۴۵۶، ۶/۴۹۸

(۲) عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، قولہ باب قول اللہ تعالیٰ بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ، حدیث نمبر:۷۵۵۲، ۱۳/۵۲۵

(۳) ذہبی، محمد حسین، سیر اعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۰۵ھ، ۳/۸۶

قرآن کی تفسیر وتوضیح کی روایت شروع دن سے جاری ہے۔ مسلمانوں کا جغرافیہ وسیع ہونے اور مختلف اقوام و مذہب میں اسلام کے پھیلاؤ کے بعد تفسیرِ قرآن کی ضرورت بڑھتی گئی۔ شروع اسلام میں یہ اصول متعین ہو چکا تھا کہ خود قرآن مجید میں ہی ایک بیان کی تفسیر دوسری جگہ مل جاتی ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی اور خود حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ تفسیر قرآن کا دوسرا ماخذ سمجھی گئی ہے۔ آپ ﷺ کے اصحاب برائے راست آپ ﷺ سے تعلیم وتربیت حاصل کیے ہوئے تھے، لہٰذا آثارِ صحابہ مآخذِ تفسیر میں تیسرا مصدر ہیں۔ اختلافِ اقوال کی صورت میں ترجیحات بھی اہل علم کے ہاں متعین کر دی گی ہیں۔ اصولین کے نزدیک تفسیرِ قرآن کے کئی اسالیب اور مصادر میں ایک اہم اسلوب اور مآخذ سابقہ صحف سماویہ ہیں۔ قرآن نے خود کئی ایک مقامات پر عقائد اور احکام وواقعات کی وضاحت کے لیے سابقہ کتبِ سماویہ سے اخذ و استدلال کیا ہے اور خود آپ ﷺ کا دینِ اسلام کی تائید ومذاہبِ باطلہ کی تردید میں بائبل سے استدلال کرنا جواز فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر اصحابِ رسول کا طرزِ عمل، اسلوب و منہج کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اکابر اصحابِ رسول مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے قرآنی آیات کی وضاحت میں سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال کرکے دینِ اسلام کے حقائق اور سچائی ثابت کی اور سابقہ صحفِ سماویہ سے ہی استدلال کرتے ہوئے ایسی آیات کی بھی وضاحت کی جن میں سابقہ صحف کا حوالہ دیا گیا تھا یا قرآن مجید کے کسی بیان سے مقصود سابقہ صحفِ سماویہ میں بیان توہمات اور تحریف و تبدل کی وضاحت مقصود تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سابقہ صحف سے استدلال سے متعلق سخت موقف اپنایا ہے، اس کی وجہ ایسے ہی ایک موقع پر ان سے سختی برتنا تھا کہ تم ان کتب میں کیا تلاش کرتے ہو؟ میں صاف ستھرا کامل نظامِ حیات لے کر آیا ہوں۔ لیکن محدثین ومفسرین اس واقع کو شروع اسلام کا گردانتے ہیں۔ سابقہ صحفِ سماویہ کا علم نہ رکھنے والے اصحاب کو اجازت دی بھی نہیں جاسکتی لیکن حضور ﷺ نے نو مسلم علمائے اہلِ کتاب ودیگر اہلِ علم کو نہ صرف اجازت دی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ سابقہ صحفِ سماویہ سے استدلال کرکے اہلِ کتاب کو حقیقتِ حال سے روشناس کرانے میں اصحابِ رسول کا منہج واسلوب ثابت کرتا ہے کہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے سابقہ کتبِ سماویہ سے اخذ واستدلال کیا جائے اور ایسے محرف ومبدل حقائق کی نشاندہی کی جائے جو سابقہ کتبِ سماویہ میں ہیں لیکن ان کتب کے مہیمن قرآن مجید نے ایسے حقائق کو برحق بیان کیا ہے۔ اہل کتاب ایسے حقائق کو پسِ پشت، آنکھیں چرائے یا پھر انکار کیے بیٹھے ہیں۔ ایسے حقائق سے متعلق ان سے سوال کیا جائے یا پھر ان کی اپنی کتب سے ان کے سامنے دلائل واضح کیے جائیں۔ امیدِ واثق ہے کہ یہ دلائل ان کے لیے ذریعہ ہدایت ثابت ہوں یا پھر ان پر حجت قائم ہو جائے۔

❁❁❁